واجدہ تبسم
پھول کھلنے دو

002 www.taemeernews.com

بے مثال ادیبہ — واجدہ تبسم

لاجواب اِدارہ — اورسیز بک سینٹر

وہ شخص تنہا نہیں جس کے پاس واجدہ تبسم کی یہ کتابیں ہیں

۱۔	شہرِ ممنوع	پانچواں ایڈیشن	۳۰ روپے
۲۔	جیسے دریا	نمائندہ ترین کہانیاں	۲۵ روپے
۳	پھول کھلنے دو	ہر بچوں پر کہانیاں	۳۰ روپے
۴	بند دروازے	بچوں کے لئے کہانیاں	۱۵ "

"شمع" دہلی کے ادارے سے شائع ہونے والی کتابیں

۵۔	نتھ کا بوجھ	گھریلو کہانیاں	۳۰ روپے
۶۔	نتھ اُترائی	طوائفوں پر کہانیاں	۳۰ روپے
۷۔	نتھ کا زخم	انوکھے انداز کا ناول	۳۰ روپے

زیرِ طبع

۸۔	اُترن	دوسرا ایڈیشن (دکنی زبان میں)	۳۰ روپے
۹۔	قصاص	پہلا ایڈیشن (دو طوائفوں پر ناول)	۳۰ روپے
۱۰	زخمِ دل اور مہک	دوسرا ایڈیشن (رومانٹک کہانیاں)	۳۰ روپے
۱۱۔	آیا بسنت سکھی	طویل کہانیاں	۳۰ روپے
۱۲	مولسری کی چھاؤں	ڈھکی چھپی کہانیاں	۳۰ روپے

ملنے کا پتہ: اورسیز بک سنٹر پوسٹ بکس ۶۹۴۹
سانتا کروز (ویسٹ) بمبئی نمبر ۵۴

www.taemeernews.com

004
www.taemeernews.com

و

پھول کھلنے دو

واجدہ تبسم

اورینٹ بک سینٹر

پلاٹ نمبر ۵۴ - ۱- نارتھ لنکن روڈ، جوہو لے پارلے
بمبئی ۵۸ فون ۵۷۸۲۶۳

www.taemeernews.com

006 www.taemeernews.com

(ب)

(جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ)

سلسلہ مطبوعات نمبر 9

بار دوم
جولائی سنہ ۱۹۸۲ء

قیمت : [redacted] روپیہ
تعدادِ اشاعت : ایک ہزار

ناشر : ٹیپو سلطان
طابع : سراج الدولہ
مطبع : یونیورسل لیتھو پریس
۲۳ نوروجی اسٹریٹ جگن ناتھ شنکر سیٹھ روڈ (ٹھاکر دوار) بمبئی نمبر ۴۰۰۰۰۲

پاکستان میں جملہ حقوق اور سیز بک سنٹر 943 بلاک نمبر ۸
عزیز آباد کراچی کے نام محفوظ ہیں

مصنفہ کا پتہ :
ریلوے بلاک ۱۳۱ - فلیٹ نمبر ۱۰ سنتاکروز (ویسٹ)
بمبئی ۵۴ فون نمبر 612-8343

www.taemeernews.com

008
www.taemeernews.com

ج

اپنے سب سے چھوٹے بیٹے

التمش کے نام

www.taemeernews.com

010 www.taemeernews.com

فہرست

۱	پھول کھلنے دو	11
۲	پگھلتی آگ	105
۳	پوجا کا مان	124
۴	میں پھر آؤں گا	173
۵	حوّا کا گناہ	203
۶	آزادی کے آنسو	215
۷	چھوٹے بڑے	235
۸	ادھورا	241

۱

پھول کھلنے دو

رات کے اندھیرے میں بھی دور ہی سے ایک بورڈ چمک چمک کر اپنی اہمیت کا اعلان کرتا نظر آتا تھا ——

" شانتی ڈاملے میٹرنٹی ہوم ——"

سیاہ، مہیب سناٹے کو چیرتی ہوئی ایک آواز دور سے اب قریب سنائی دینے لگی —— یہ بیل گاڑی کی چرخ چوں چرخ چوں کی آواز تھی —— شاید کوئی حاملہ اس میں تڑپ رہی تھی کیونکہ گاڑی کی چرخ چوں سے ہٹ کر کبھی کبھی ایک تیز نسوانی چیخ بھی سناٹے میں گونج گونج اٹھتی تھی ——

گاڑی پھاٹک میں داخل ہوئی اور آواز سنتے ہی لیڈی ڈاکٹر شانتی ڈاملے برآمدے میں نکل آئی۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ آج نرس بھی چھٹی پر تھی اور دایا بھی —— جو کچھ کرنا تھا ڈاکٹر ہی کو اکیلے کرنا تھا ——

ساتھ میں کوئی مرد نہیں تھا —— حاملہ عورت کو سہارا دے کر ایک بوڑھی سی ملگجی عورت نے بمشکل اتارا —— انسانی ہمدردی کے جذبے سے چور ڈاکٹر لپک کر سیڑھیاں اتری اور ایک طرف سے سہارا دے کر دونوں حاملہ کو لیبر روم تک لے آئیں ——

" مائی تم باہر ہی بیٹھو —— میں تمہاری بیٹی کو ابھی دیکھتی ہوں ——"

"میں اس کی پڑوسن ہوں ــــ" بڑھیا نے غیر ضروری سا جواب دیا ــــ
"کوئی بات نہیں ــــ تم باہر ہی بیٹھو ــــ"
حاملہ کو ٹیبل پر لٹا کر لیڈی ڈاکٹر نے صابون سے ہاتھ دھوئے اور دستانے چڑھا رہی تھی کہ حاملہ نے عجیب لجاجت آمیز لہجے میں، اتنے درد اور کرب کی حالت میں بھی اسے مخاطب کیا ــــ
"میم صاحب ــــ مجھے بیٹا چاہیئے ــــ"
ڈاکٹر پہلے تو متعجب ہوئی ــــ پھر ذرا مسکرائی۔
"بائی ــــ یہ تو بھگوان کے ہاتھ ہے۔ میں تو صرف تمہاری تکلیف ہی دور کر سکتی ہوں ــــ"
"حاملہ چیخ کر اٹھ بیٹھی ــــ "نہیں ــــ نہیں۔ مجھے بیٹا ہی دینا میم صاحب۔ آگے ہی میری دو ــــ دو بیٹیاں موجود ہیں اور ان کے باپ نے صاف کہہ دیا ہے کہ اگر اب کے بیٹی ہوئی تو وہ ہم سبھوں کو مار ڈالے گا..... میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں میم صاحب..... دیکھو نا اسی لیئے تو ساتھ میں آیا بھی نہیں.. ... لیڈی ڈاکٹر نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے لٹا دیا ــــ تیز درد کی ایک اور لہر نے حاملہ کو پھر سے بے حال کر دیا تھا ــــ لیکن وہ اس درد کو بھول کر کہے جا رہی تھی ــــ
"میم صاحب اگر قسمت سے بیٹی ہی ہو جائے تو تم اسے مار ڈالنا مگر مجھے اب اور بیٹی کی ماں مت بنانا ــــ" ڈاکٹر اس کی بک بک کو بھول کر اپنے پیشے کے روایتی انہماک میں جت گئی تھی ــــ
"تم یہ کیوں سوچتی ہو کہ تمہیں بیٹی ہی ہو گی۔ بھگوان بیٹا بھی تو دے سکتا ہے ــــ"

وہ اس کے پیٹ پر اسٹیتھسکوپ لگائے، کان قریب کئے بچّے کی دھڑکن بھی سُنتی جا رہی تھی ــــ

"بھگوان ہم غریبوں پر اتنی دیا کیوں کرنے لگا؟ بیٹے تو وہ بڑے لوگوں کو دیتا ہے۔ ہمیں تو غریبی بڑھانے کے لئے بیٹیاں ہی ملتی ہیں ..... درد کی ایک تیز لہر نے پھر سے اس کی زبان روک دی۔

"اچھا اب تم چپ چاپ پڑی رہو۔ زیادہ باتیں کروگی تو زچگی میں مشکل ہو جائے گی۔ سانس روکو تو بچّہ جلدی پیدا ہوگا .....

اُس وقت تک درد کی لہر آکر جا چکی تھی اور حاملہ پھر سے اپنی ضد پر مستعد تھی ــــ

"میم صاحب اگر بیٹی ہو ہی گئی تو تم ہاسپٹل کے کسی بیٹے سے میری بیٹی بدل سارا کام تو تم کرتی ہو کسی کو کیا پتہ چلے گا کہ کس کو بیٹا ہوا تھا اور کس کو بیٹی ....."

ابھی ڈاکٹر نے اسے غصّہ سے گھورا ہی تھا کہ باہر سے کار کے ہارن کی تیز آواز سُنائی دی ــــ شاید کسی بڑے آدمی کے گھر کا کیس آگیا تھا۔ کیونکہ اطراف واکناف میں ساری غریب آبادی تھی کسی کسی کے پاس ہی گاڑی تھی ــــ

"یا مصیبت ــــ" ڈاکٹر نے دل ہی دل میں سوچا۔ آج اسٹاف چھٹی پر ہے اور دو دو کیس ــــ خیر بھگوان مالک ہے ــــ"

ڈاکٹر پہلے کیس کو چھوڑ کر دوسرے کیس کی طرف لپکی۔ بہو کو ساس لے کر آئی تھیں ــــ کپڑوں اور زیوروں سے ہی اعلیٰ رکھ رکھاؤ کا پتہ چل رہا تھا۔ آتے ہی ساس نے سنا دیا یوں جیسے ڈاکٹر پر احسان کر رہی ہوں ــــ

بہو کا کیس تو شہر کے ہاسپٹل میں تھا، مگر رائے بہادر اتفاق سے کسی کام سے شہر گئے ہوئے ہیں، درد اٹھا تو بھاگم بھاگ ہم یہیں لے آئے ــــ"

ڈاکٹر اس قسم کے نخروں کی عادی تھی مسکرا کر بولی۔

"کوئی بات نہیں ــــ میں ابھی انھیں بھی دیکھتی ہوں ــــ"

ڈاکٹر نے باہر جھانکا کہ پہلی حاملہ کے ساتھ والی پڑوسن کو چائے کافی کے لئے کہے، مگر وہ پڑوسن کا حق نبھا کر واپس جا چکی تھی ــــ باہر گاڑی میں ڈرائیور اور ایک دو نوکر بیٹھے بیڑی سگریٹ پی رہے تھے ــــ

"کیا مصیبت ہے ــــ اس نے ذرا جھلا کر سوچا۔ اب کافی بھی مجھے ہی بنا کر دینی پڑے گی۔"

وہ کافی کے لئے دودھ گرم کرنے مڑی ہی تھی کہ پہلی والی حاملہ کی تیز چیخوں کو سن کر تیزی سے دوڑی آئی ــــ بچہ پیدا ہونے ہی کو تھا۔

سارا سامان تو تیار ہی تھا ــــ کمرے میں دوسری طرف ایک اور ٹیبل تھا جس پر رائے صاحب کی بیوی لیٹی ہوئی تھی۔ بیچ میں پردہ پڑا ہوا تھا ــــ دو حاملہ عورتیں ایک ہی کمرے میں ہوں تو ڈاکٹری اصول سے بیچ میں پردہ تان دیا جاتا ہے کہ ایک دوسری کو دیکھ کر دہشت زدہ نہ ہوں ــــ

بڑی مایوسی سے لیڈی ڈاکٹر نے دیکھا ــــ پہلی حاملہ کو پھر سے لڑکی ہی پیدا ہوئی تھی!

"لیکن مجھے ابھی اس کی اطلاع نہیں دینی چاہیئے۔ زچہ کے لئے غم کی یا خوشی کی غیر متوقع خبر کبھی کبھی جان لیوا بھی ثابت ہو جاتی ہے ــــ" وہ سٹر پٹر کرتی رہی۔ بیچ بیچ میں پہلی عورت کی آوازیں ابھرتی رہیں ــــ

"میم صاحب مجھے کیا پیدا ہوا ہے ــــ"

"میم صاحب لڑکا ہی ہے نا ــــ؟"

"میم صاحب لڑکا......"

ڈاکٹر صاحبہ نے ذرا خوش دلی سے کہا ــــ "اتاؤلی کیوں ہوئی جا رہی ہو ــــ ابھی بتا دیں گے

اور تم سے مٹھائی بھی کھائیں گے ــــ"

وہ اُداسی سے بولی ــــ" مٹھائی ہم غریب کہاں سے کھلائیں گے میم صاحب! یہاں تو روٹی کے لالے پڑے رہتے ہیں.....

ڈاکٹر ہنس کر بولی۔" تو اچھا ہے ہم تمھیں کھلا دیں گے ــــ"

بچی بچی چلّا کے روئے جا رہی تھی۔" تھینک گاڈ۔ چھوٹے بچے کی آواز سے پتہ نہیں چل سکتا کہ لڑکا ہے یا لڑکی ــــ ورنہ یہ عورت اپنا کیا حشر کر ڈالتی؟"

اُسی وقت دوسری حاملہ نے بے چینی کا مظاہرہ کرنا شروع کیا ــــ ڈاکٹر تیزی سے اس کے قریب پہونچی ــــ کبھی کبھی حاملہ کی تکلیف کم کرنے کے لئے اسے باتوں میں بہلانا بھی بہت سود مند ثابت ہوتا ہے ــــ

"آپ کا نام کیا ہے ــــ" ڈاکٹر مسکرا کر بولی۔

"ریکھا ــــ" ریکھا اپنے آپ کو سنبھال کر بولی۔

پھر اُس نے ذرا غور سے ڈاکٹر کو دیکھا اور اتنی تکلیف کے باوجود ذرا ہنس کر بولی ــــ" آپ بڑی سندر ہیں ڈاکٹر ــــ"

ڈاکٹر ذرا دکھ سے مُسکرائی ــــ" ہاں مگر اتنی بھی نہیں کہ کسی کے بھاگ کی ریکھا بن پاتی ــــ"

"آپ نے شادی نہیں کی ڈاکٹر....." ریکھا نے اپنی بات کے جواب سے پہلے سے پیٹ پکڑ لیا ــــ مرگئی ــــ"

ڈاکٹر ہنسی ــــ" آپکا پہلا بے بی تو نہیں ہے نا یہ۔ پھر زرا دھیرج سے کام لیجئے نا؟

"دوسرا ہے ــــ ریکھا ہانپ کر بولی۔" پہلا بیٹا ہے۔ اب مجھے تو بیٹی کی چاہت ہے۔

مگر اتنے درد کے باوجود بھی وہ ہنسی۔" ماں جی کو بیٹا ہی چاہیے۔ انھیں پوتوں کی فوج چاہیے...
درد کی ایک اور لہر آکر گذر گئی تھی، جو تڑپتی ہوئی عورت کو پھر واپس حواسوں
میں لے آتی ہے ــــــ

"میم صاحب ــــــ مجھے میرے بیٹے کی صورت تو بتادو۔" پہلی زچہ نے پھر پکارا ــــ
ڈاکٹر ہنس کر اس کے قریب آئی۔ اس کا گال تھپکایا۔
"بیٹے کا نام کیا رکھوگی ــــ؟"
"بُندو ــــ" عورت خوشی اور کچھ فخر سے بولی ــــــ
ڈاکٹر نے سہم کر اسے دیکھا ــــ اور کچھ رک رک کر پوچھا ــــ ہریجن ہو ــــ؟"
عورت نے اداسی سے سر ہلا دیا ــــ نہ بھی ہلاتی تو ڈاکٹر نام سے ہی سمجھ گئی
تھی ــــ بڑے لوگ ایسے عجیب نام نہیں رکھتے ــــ بُندو۔ کلّو۔ ڈھیبو۔
یہ اور ایسے سارے نام اس کی اپنی زندگی کی ساری داستان اُسے یاد دلاتے
دیتے تھے ــــ وہ خود بھی تو ایک نیچ ذات سے تھی!
اچانک اس کا دل دکھ سے بھر گیا ــــ اگر اس عورت کو یہ معلوم ہو جائے کہ
اُس نے پھر سے ایک لڑکی کو جنم دیا ہے تو شاید...... شاید وہ خود اپنی اور اُس
بچّی کا خاتمہ کر ڈالے۔ یا شاید اُس کا شوہر سبھوں کو ختم کر دے، یا گھر سے نکال دے
ــــ یا گھر چھوڑ کر خود کہیں چلا جائے ــــــ غریبی میں لڑکیاں ہی لڑکیاں ہونا
کتنے دکھ کی بات ہے۔ اُنھیں عذابوں سے پالنا۔ بھوکی نگاہوں سے جوانی میں بچانا
ــــ پھر شادی! جو سراسر تھیلی بھر روپوں کا سوال تھی ــــــ
"کیا میں یہ گناہ مول لے لوں ــــ؟ بچے بدل دوں؟ لیکن یہ کیا ضرور ہے
کہ رائے صاحب کی بیوی کو بیٹا ہی ہو ــــــ

وہ تیزی سے اُٹھی ـــــ مذہب ذات پات، بھگوان خدا، اُس کے لئے یہ سب چیزیں بے معنی تھیں۔ زندگی نے اُس کے ساتھ جو بھیانک سلوک کیا تھا تو وہ ہر چیز سے دستبردار ہوگئی تھی۔ اسی لئے نہ اس کے گھر میں مندر کا استھان تھا نہ کہیں بھگوان کی مورتی ـــــ ہاسپٹل میں بھی وہ یوں رہتی کہ کسی کو اس کے مذہب اور ذات پات کا اندازہ نہ ہوتا ـــــ لیکن اچانک ان دیکھی قوت کے آگے اُسکا سر جُھکا دینے کو جی چاہا ـــــ وہ اپنے کمرے میں گئی۔ کیلنڈر پر کسی دیوتا کی فوٹو تھی۔ پتہ نہیں وشنو بھگوان تھے، یا کرشن یا ہنومان جی ـــــ اس نے برسوں کے بعد پرارتھنا کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کیں اور سر جھکا کر دل ہی دل میں بولی۔

"اگر تو دلوں کی تڑپتی دُعا واقعی سنتا ہے تو آج میں اپنے لئے نہیں، کسی اور کے لئے ایک دعا مانگتی ہوں ـــــ بھگوان ریکھا کو بیٹا دے دے۔"

ڈاکٹر ـــــ باہر سے بوڑھی ساس کی تیز آواز سُنائی دی اور وہ لپک کر لیبر روم میں پہونچی۔ ایک اور ہستی دنیا میں قدم رکھنے کے لئے، اپنی قسمت میں لکھی تمام تر بُرائیوں اور اچھائیوں، تمام تر سکھ اور دکھ، جھیلنے کے لئے کمربستہ ہوچکی تھی ـــــ ڈاکٹر تیزی سے واش بیس کی طرف بڑھ گئی ـــــ

چند منٹوں کی جدوجہد نے ایک عورت کو پرسکون کردیا اور دوسری عورت ـــــ جو لیڈی ڈاکٹر تھی کا سکون لوٹ لیا ـــــ ریکھا کو بیٹا پیدا ہوگیا تھا ـــــ چند لمحے پیشتر ڈاکٹر جس مستعدی سے کام کر رہی تھی وہ مفقود ہوچکی تھی ـــــ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں ہزاروں خیالات اس کے ذہن سے آ کر نکل جاتے تھے ـــــ

"نہیں نہیں میں بیگناہ مول نہیں لوں گی۔ مجھے کیا جس کے نصیب میں جو لکھا ہے وہ بھگتے گا ——"

پھر دل اسے کچوکتا —— "شانتی ڈاملے ذرا سوچو کس لجاجت سے وہ ہریجن عورت تم سے بیٹے کی بھیک مانگ رہی تھی —— اگر اس کے شوہر نے ایک سالہ سبھول کو مار ڈالا تو چار جانوں کا خون تمہاری گردن پر ہوگا ——"

مگر میں یہ ظلم کیسے کروں —— بچے کیسے بدل دوں۔ ممکن ہے بھگوان نے اُن لوگوں کی زندگی ہی اتنی لکھی ہو!"

"ارے ذرا سوچو امیر گھر میں لڑکا کیا —— لڑکی کیا ٹھاٹ سے رہیں گے —— ویسے دیکھا خود لڑکی چاہ رہی تھی۔ اور .....

اس نے گھبرا کر اپنے آپ کو دیکھا —— پسینہ نہ صرف قطرہ قطرہ بلکہ موجیں بن کر اس کے وجود کو ڈبوئے دینے پر تلا ہوا تھا —— اس نے ٹھنڈی ہوا کے ایک جھونکے کی خاطر کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا —— اور باہر کا منظر دیکھتے ہی اس کا خون اس کی رگوں میں منجمد ہو کر رہ گیا ——

باہر رائے صاحب کھڑے تھے ——

رائے صاحب اشوک چکرورتی !

اس کا اپنا اشوک !! جو اُسے وقت کی بے رحم موجوں کے حوالے کر گیا تھا اور پھر کبھی پلٹ کر خبر نہ لی تھی —— جس کے ہاتھوں اُس نے اپنی زندگی، خوبصورتی اور جوانی کا ہر ہر لمحہ سونپ دیا تھا۔ اور جب اس کے پیٹ میں ننھی سی جان کلبلانے لگی تھی اور اُس نے شادی کے لیے کہا تھا تو اُس نے وہی امیروں کی روایتی بے رحمی کے ساتھ کہا تھا۔

"ہم سے ہنسی دل لگی میں ایک بے وقوفی ہوگئی تھی۔ کیا تم ابارشن نہیں کروا سکتیں؟"

"ابارشن ــــ"؟ اس نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

"ہاں ہاں ابارشن ــــ آخر کالج میں پڑھنے والی ایک لڑکی اس لفظ سے معنی تو جانتی ہی ہوگی۔ یا پھر ڈکشنری میں دیکھ لو ــــ"!

"اشوک ــــ" وہ جیسے ڈوبتے ڈوبتے بولی۔

"لیکن اگر ہم شادی کرلیں تو اپنا بچہ محفوظ بھی کرسکتے ہیں ــــ"

"شادی ــــ" وہ بیحد اجنبی بن کر بولا ــــ

شادی کیسے ممکن ہے ــــ ساری دنیا جانتی ہے تم ہریجن لڑکی ہو ــــ اور ڈیڈی ــــ؟ کیا تم سمجھتی ہو ڈیڈی مجھے اس کی اجازت دے دیں گے ــــ"؟

اور پھر وہ اس کی مرضی کے بغیر اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے یہاں لے گیا اور زبردستی الٹی سیدھی دوائیں پلا کر اُسے اس جنت سے محروم کردیا جو ماں بننے پر ہی قدرت کسی بھی عورت کے قدموں تلے تعمیر کرتی ہے ــــ

اُس نے تیزی سے پردہ کھینچ دیا ــــ وہ ایسے زاویئے سے رائے صاحب کو دیکھ رہی تھی کہ وہ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے ــــ اُس نے بمشکل خود کو کرسی پر گرا دیا ــــ

"رائے صاحب ــــ زندگی بھر کبھی بھگوان کو نہیں مانا۔ آج مان گئی ــــ کیونکہ بھگوان نہ ہوتا تو کون سی طاقت تھی جو مجھے تم جیسے نیچ سے بدلہ لینے کا موقع عطا کرتی ــــ؟ اب تمہارا بچہ ــــ تمہارے جگر کا ٹکڑا ہریجن بستی میں پلے گا ــــ بیگار میں گھسیٹا جائے گا۔ زمینداروں کے جوتے کھائے گا امیروں کی گالیاں سمیٹے گا اور میں قہقہے لگاؤں گی ــــ"!

ڈاکٹر ریکھا کی کانپتی آواز آئی ــــ

بیٹا یا بیٹی ــــ"؟

ڈاکٹر اس کے قریب گئی ــــ ایک بار پھر اس کا دل ڈگمگا گیا ــــ "اب بھی وقت ہے ــــ گناہوں سے بچنے کا ــــ نیکاں سمیٹنے کا۔"

پھر اچانک اُسے اپنی زندگی بھر کی محرومیاں اور دکھ یاد آئے ــــ عجیب مخمصے میں جان تھی ــــ

"اتنی جلدی کیا ہے ــــ ابھی دیکھ ہی لینا نا" وہ بظاہر مسکرائی ــــ مگر دل میں آگ سی لگی ہوئی تھی ــــ

اچانک دروازہ کھلا اور نرس داخل ہوئی ــــ

"ارے سسٹر ــــ تم ــــ ڈاکٹر بے حد حیرت زدہ ہو کر بولی ــــ تم تو دو دن کی چھٹی لے کر گئی تھیں نا؟"

"جی ہاں ــــ لیکن شہر جانے والی آخری بس بھی نکل گئی تھی جب میں اسٹاپ پر پہنچی تو میں نے سوچا کہ چل کر آپ کو ھیلپ ہی کر دوں ــــ اگلے ہفتہ چلی جاؤں گی۔"

پھر وہ مسکرا کر اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی بولی ــــ

"ارے میرے جاتے ہی آپ کو دو۔ دو کیس نبٹنے پڑے ــــ" پھر وہ ہنس کر آگے بڑھی۔ سامنے ہی ٹیبل پر دو ننھی منی جانیں اپنے حال اور مستقبل سے بے خبر ٹھٹھرتی پڑی تھیں ــــ نرس نے کپڑے اٹھا کر دیکھا اور ہنسی ــــ "ایک لڑکا ایک لڑکی ہے" پھر مڑ کر ڈاکٹر سے بولی۔ "بیٹا کس کا ہے اور بیٹی کس کی ہے"؟

لیڈی ڈاکٹر شانتی ڈاملے نے اپنے دھڑ دھڑ دھڑکتے دل کو قابو میں کیا اور لمبشکل بولی۔

"بیٹا اِس ہریجن عورت کا ہے۔ اور بیٹی رائے بہادر اشوک چکرورتی کی ــــ"

ریکھا کی آنکھ لگ گئی تھی ورنہ وہ پوچھتی ضرور کہ میرے شوہر کا نام تمہیں کیسے معلوم ہوا، جبکہ ابھی میں نے بتایا تک نہیں — !

دوسرے دن اس شدید خلفشار سے بچنے کی خاطر لیڈی ڈاکٹر ایک ہفتہ کے آرام کے لئے شہر چلی گئی — وہ اشوک کا کسی حال سامنا کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ ویسے بھی نرس اس کی غیر موجودگی میں ہر کیس اچھی طرح سنبھال لیتی تھی —

جب وہ ہاسپٹل سے گھر جا رہی تھی تو نرس دونوں بچوں کو تب تک نہلا چکی تھی — بچی کو اس کی ماں کے پاس سلا کر اب وہ لڑکے کو گود میں اٹھائے ہوئی تھی —

"ڈاکٹر دیکھئے کتنا گل گوتھنا سا بچہ ہے — ڈاکٹر خاموش رہ گئی مگر نرس سنائے گئی۔

"ہمارے یہاں ایسے تو کتنے بچے پیدا ہوتے ہیں مگر پتہ نہیں کیا بات ہے مجھے اتنا سوئیٹ کبھی کوئی بچہ نہ لگا اور ڈاکٹر ایک چیز نوٹ کی آپ نے — اس کے سیدھے بازو پر ایک چاند کی طرح کا پیدائشی نشان ہے۔ میری ماں کہتی ہیں کہ ایسے نشان کو پدم کہتے ہیں جو بہت ہی دھن وان اور بڑے آدمی ہونے کا نشان ہوتا ہے" اور اس نے اس کا چھوٹا سا ننھا منا بازو کھول کر بتایا جہاں پر ایک چاند اس کے نصیبوں کی سیاہی پر مسکرا رہا تھا —" !

لیڈی ڈاکٹر نے اپنے جذبات چھپاتے ہوئے لاپرواہی سے کہا —

"اپنے اپنے نصیب کی بات ہے — ہریجن کے ہاں جنم تو لیا ہے پر کیا پتہ بھگوان واقعی اسے بڑا آدمی بنا دے —"

ویسے یہ بات کہتے کہتے خود اُسے بھی اس بچے کے نصیب پر بے حد ترس آیا۔ اور اس نے اپنے آپ میں سوچا کہ زندگی کے گھور اندھیروں میں اب تمہارے لئے

روشنی کی ایک ہلکی سی رمق تک نہیں سوائے اس نام نہاد چاند کے جو قدرت نے تمھارے بازو پر طلوع کر دیا ہے۔" !

وقت کے نقارے پر ایک ایک کر کے بارہ چوٹیں اور پڑیں ـــــ قدرت کے مہربان اور نا مہربان ہاتھوں نے جو ادلا بدلی کر دی تھی اس کے صلے میں سلیکھا خوشیوں اور عیش کے جھولوں میں جھول رہی تھی اور بندو جوانی سے پہلے ہی بڑھاپے کی منزلیں طے کر رہا تھا ـــــ

"جا ـــــ باپ کو یہ کھانا دے آ ـــــ" ماں نے اُسے آواز دی جو گلی کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیل رہا تھا ـــــ

" اور سُن ـــــ ماں نے جاتے جاتے اسے چتاونی دی۔ زمیندار کی حویلی میں زیادہ دیر مت ٹھہرنا۔ کوئی بھی ایسی ویسی شرارت کر دی تو پٹائی ہوگی ـــــ"

آج اس کی بارہ سالہ زندگی کا پہلا واقعہ تھا کہ زمیندار کی حویلی کے درشن کرنے جا رہا تھا۔ ماں اس لئے بھی اسے بچا بچا کر رکھتی تھی کہ کسی کی نظر نہ پڑ جائے اور اوپر کے کام کے بہانے ابھی سے اسے چھین لیا جائے۔ بندو اس کی جان تھا۔ ایمان تھا۔ اور بندو بھی ماں کا دیوانہ۔

باپ کا کھانا لے کر جب وہ حویلی میں پہونچا تو اس نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا ـــــ حویلی کے ساتھ ملے ہوئے میدان میں باپ جھاڑو دے رہا تھا لیکن عجیب و غریب بات یہ نہیں تھی کہ باپ جھاڑو دے رہا تھا، عجیب و غریب بات یہ تھی کہ باپ کے پیٹھ کے پیچھے سے ہو کر ایک جھاڑو بندھی ہوئی تھی ـــــ وہ جہاں بھی قدم رکھتا جھاڑو اس کے پیچھے پیچھے جاتی ـــــ جب جھاڑو دے چکا اور کیاریوں کی صفائی کرنے

لگا تب بھی وہ جھاڑو یونہی بندھی لٹکی تھی۔
باپو ـــــ وہ کھانے کی پوٹلی رکھ کر حیرت سے بولا ـــــ "یہ تمہارے پیچھے جھاڑو کیوں لٹک رہی ہے ـــــ"
باپ نے بیحد لاپروائی سے جواب دیا ـــــ "جہاں جہاں بھی میرے پاؤں اِس پوتر دھرتی پر پڑتے ہیں، پیروں کا نقش چھوڑ جاتے ہیں، انہی ناپاک نشانوں کو مٹانے کے لئے مجھے یہ جھاڑو ہمیشہ باندھے رکھنی پڑتی ہے۔" پھر وہ جھلا کر بولا۔
"مگر تجھے ان تمام باتوں سے غرض ـــــ؟ پاٹھ شالا گیا تھا یا نہیں ـــــ؟"
"نہیں ـــــ بندو جھلا کر بولا ـــــ پنسل ختم ہو گئی تھی، گرو جی نے اسکول سے باہر بھگا دیا۔"
باپ جل کر بولا ـــــ "تو گھر جا کر مر ـــــ یہاں کیوں آیا مجھ سے سوال جواب کرنے ـــــ!"
بندو نے دوسری ہی بات کی ـــــ "باپو اور جو حویلی والوں کے پاؤں کے نشان پڑتے ہیں تو وہ سب بھی جھاڑو باندھ کر گھومتے ہیں کیا ـــــ؟"
باپ نے گھبرا کر ادھر اُدھر نظر ڈالی اور پھر اُس خطرناک چھوکرے کی طرف گھور کر بولا ـــــ حرام زادے اُلٹا لٹکوائے گا کیا ـــــ نکل یہاں سے ـــــ'
بندو ذرا ڈر کر تھوڑی دور گیا ـــــ پھر کھڑا ہو گیا وہیں سے بولا ـــــ
"باپو میں بڑا ہو جاؤں گا تو زمیندار کی کمر سے جھاڑو بندھوا دوں گا ـــــ"
باپ رے ..... حرام زادے ـــــ ٹھہر تو سہی۔" باپ نے ایک پتھر اٹھا کر بندو سے بیٹے کی طرف اچھالا ـــــ بندو تو ہٹ گیا، قسمت سے اسی وقت زمیندار کا بڑا بیٹا وہاں آ نکلا اور پتھر سیدھا اُس کے ماتھے سے جا لگا ـــــ
" مر گیا ـــــ" کہتے ہی وہ دوہرا ہو گیا۔ پورے باڑے میں ہلڑ مچ گئی ـــــ مرد عورتیں، مالک نوکر سبھی نکل آئے ـــــ ایک جھاڑ کے پیچھے بندو کھڑا سارا تماشا دیکھتا رہا۔

"کیوں بے کلّو ــــ" ایک بارعب آدمی نے بندو کے باپ کو مخاطب کیا ــــ
"یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں ــــ" اور ساتھ ہی ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی زور سے اس کے ماری۔ "کلّو تڑپ کر بولا ــــ سرکار۔ مائی باپ غلطی ہوگئی ــــ م۔م۔میں اصل میں اپنے چھوکرے کو مار رہا تھا کہ.....

تیرا چھوکرا مر بھی جائے تو ہمارا کیا بگڑ جائے گا۔ سوال تو ہمارے بیٹے کا ہے ــــ" پھر انھوں نے گردن گھما کر آواز دی ــــ

"اِس کو اپنے بیٹے اور ہمارے بیٹے میں فرق نہیں دیکھتا ــــ ذرا اسکی آنکھوں میں لال سرمہ تو لگاؤ تاکہ آنکھیں روشن ہو جائیں ــــ"

ایک نوکر جھٹ پٹ دوڑ کر پڑیا میں کچھ لے آیا ــــ دو نوکروں نے پکڑ کر کلّو کو لٹایا اور اس کی آنکھوں میں چٹکی چٹکی بھر پسی ہوئی لال مرچ جھونک دی۔

کلّو ہائے ہائے کر کے کٹے ہوئے مرغ کی طرح اُچھلنے لگا اور سب تماشہ دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگے ــــ بندو تڑپ کر سامنے نکلا اور سیدھا زمیندار کے سامنے آکر بے باکی سے بولا۔ "چھوٹے سرکار کو پتھر لگا ضرور تھا، مگر خون تھوڑی نکلا۔"

"اچھا ــــ زمیندار نے اُسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو آپ عدالت لگانے آئے ہیں"۔.....

ابھی وہ کچھ حکم دینے ہی والے تھے کہ کلّو اپنی آنسو برساتی آنکھیں، آدھی کھلی، آدھی بند بھید زور سے چیختا گالیاں بکتا اٹھا اور گالیوں کے ساتھ ساتھ لاتوں اور گھونسوں سے بندو کو زمین پر ڈھیر کر دیا۔

"حرام زادے سور کے جنے۔ قصور تو قصور اوپر سے زبان کھولتا ہے۔ آج تیری ہڈیوں کو چورا نہ کر دوں تو کلّو نام نہیں ــــ"

زمیندار بیٹے کا ہاتھ تھام کر حویلی میں چلے گئے ـــــ دوسرے لوگوں نے
کلّو کو روکا۔" ارے ناحق مرجائے گا۔ بس کردے۔ بچہ ہی تو ہے ـــــ"
رات کو نمک ملے گرم پانی سے شوہر کی آنکھوں پر ٹکو دکرتے کرتے بندد کی
ماں بولی ـــــ
" ایسے زمیندار کی نوکری ہی کیوں کرتے ہو جی جو راکھشش ہے۔ بھلا یوں
آنکھوں میں کوئی مرچی بھروا تا ہے ـــــ"
کلّو پھر بندو پر لپکا ـــــ یہ اس حرام زادے نے مجھ سے سب کہا
ہوگا نا ـــــ؟ اس سے آگے ہزار بار میں نے جوتے کھائے۔ گالیاں کھائیں۔
اُلٹا لٹکوایا گیا ـــــ آنکھوں میں مرچیں بھیں ـــــ کبھی مجھ سے کچھ کہا ـــــ یہ آج
اس حرامزادے نے پہلی بار آتے ہی آسمان سنگا مہ کیا۔ اسکو سالے کو زندہ نہ چھوڑونگا۔"
دونوں لڑکیاں دبک کر کونوں میں ہو گئیں۔ ماں ہاں ہاں کرتی رہی، مگر کلّو
پھر بندو پر ٹوٹ گیا۔ بندو مار کھاتا رہا جب باپ خود ہی تھک گیا تو بندو بڑبڑی
سے بولا۔" بڑے بہادر بنتے ہو تو ایک آدھ بار ایسی ٹھکائی زمیندار کی بھی کردنا ـــــ"

رائے زادہ اشوک چکرورتی، شہر کے پلے بڑھے کالج کے پڑھے لکھے،
جوانی پوری شہر میں گذری، لیکن باپ نے جب زمینداری سنبھالنے کا کہا تو انہیں
بھی ایسی کوئی بُری بات نہ لگی۔ اچھی خاصی ترقی یافتہ زمینداری تھی ـــــ جدید سامان
سے آراستہ ـــــ کھیتی باڑی کا کام ہل بیل سے بھی چلتا اور اب نیا نیا ٹریکٹر بھی
آیا ہوا تھا۔ گھر کی کار بھی۔ گھوڑے بھی۔ بڑی سی حویلی تھی۔ شہر کی پڑھی لکھی برابری
کی حیثیت والی لڑکی سے باپ نے شادی بھی کروادی تھی۔ سبھی کچھ میسّر تھا۔

گاؤں میں رہے تو کیا ـــــ پھر فاصلہ بھی کون بڑا تھا، اور گھر کی کار میسر تھی تو جب جی چاہے جا آ سکتے تھے۔ سو باپ کے کہے کو پورا کیا۔ اور پوری زمینداری باپ کے جیتے جی ہی سنبھال لی ـــ

اونچی حیثیت کے اور بھی کئی گھرانے گاؤں میں تھے نگران کی حیثیت مانی ہوئی تھی ـــ اسی طرح گاؤں غریبوں اور خاص طور سے ہریجنوں سے بھی بھرا پڑا تھا، مگر آزادی مل جانے کے باوجود بھی ان کا حال وہی پہلے جیسا تھا بلکہ پہلے سے بھی بدتر۔ کیونکہ پہلے تو بھی یہ بات تھی کہ انگریز سبھی کو ایک لاٹھی سے ہانکتا تھا، اس کے لئے سبھی ہریجن تھے اور وہ سب کا آقا ـــ لیکن آزادی کے بعد اپنے ہی لوگ حاکم بن بیٹھے۔ اور بات بن بات آنکھیں نکالنے لگے ـــ

ایسے ہی سینکڑوں گھرانوں میں سے ایک کلّو کا بھی تھا ـــ کئی ہریجن دوسرے اونچی ذات والوں کے گھروں اور کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ کلّو خوش نصیبی یا بد نصیبی سے اشوک رائے زادہ کی جاگیر تھا ـــ وہ اُن کے گھر بار، بڑی سی حویلی کے بھی متعدد کام کرتا اور کھیتوں پر بھی جاتا۔ قاعدے کے مطابق اس کی اولاد کو بھی اسی جگہ بعد میں کام ملنا چاہیے تھا جہاں وہ کرتا رہا تھا۔ اور اُس نے اپنے طور پر سوچ رکھا تھا کہ بندو کو دھیرے دھیرے سارے کاموں سے واقف کرواتا جائے گا، لیکن پہلے ہی دن آ کر اس نے جس ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا تھا اُس نے اندر ہی اندر اسے سہما دیا تھا ـــ

اُس دن کام پر جاتے ہوئے اس نے اپنی بیوی کو جتا دیا ـــ

"دیکھ آگے سے اب اس حرام زادے کو میرے پاس نہ حویلی پہ بھجوانا نہ کھیت پہ ـــ بن ناحق کو مصیبت"!

"پاٹھ شالہ سے آکر کوئی کام بھی تو نہیں رہتا اُسے۔ کسی چھوٹے موٹے دھندے سے کیوں نہیں لگا دیتے۔ چار پیسے آئیں گے تو کچھ ہاتھ بھی کھلے گا۔ یہاں تو وہی، کسی دن آدھا پیٹ اور کسی دن فاقہ!"

کلو جھلا کر بولا ــــ "آج ہی سارے جھگڑے نمٹانے ہیں کیا ــــ بعد میں سوچیں گے ــــ"

لیکن رکمنی نے اُسی وقت ایک چھوٹا موٹا دھندہ سوچ لیا تھا ــــ اُس نے مارے شوق کے یونہی اپنے جھونپڑے کے پچھواڑے پھولوں کے پودے لگا رکھے تھے۔ کوئی کوئی عورت بڑی بھاگ بھری ہوتی ہے کہ اس کے ہاتھ کے لگائے پھل پھول خوب پھلتے ہیں۔ تھوڑے ہی ہفتوں میں پچھواڑا مہکنے لگا تھا ــــ اُس نے سوچ لیا تھا کہ پھولوں کے گجرے بنا کر بندو کے ہاتھ بکوا دیا کرے گی ــــ مندر پر پھول چڑھانے والوں کی بہتات ہوتی ہے، سنیچر اور منگل کو تو خوب ہی پھول بکیں گے ــــ

پہلے ہی دن ایک ہنگامہ ہو گیا ــــ ایک پنڈت جی نے بندو سے ایک گجرا خرید کر بھگوان کے چرنوں میں ارپت کر دیا ــــ ایک پنڈت نے ایک مالا بھگوان کے گلے میں ڈال دی ــــ باقی ہار پھول بھی جلد ہی بک گئے ــــ جب جلدی جلدی پیسے سمیٹ کر خوشی سے باولا اتاولا بندو چلنے ہی کو تھا کہ ایک کرخت صورت والے آدمی نے اُسے گردن سے پکڑ لیا ــــ

"کیوں بے ــــ ہمارا دھرم بھرشٹ کرے گا ــــ"

دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کا ٹھٹ لگ گیا ــــ جس آدمی نے اُسے گلے سے پکڑا تھا وہ حویلی میں زمیندار کا گرگا تھا۔ اور جس دن پتھر والی واردات

ہوئی تھی وہ بندو کو اکثر کر بات کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا ۔
"یہ لونڈا آگے چل کر بہت حرام زادہ ثابت ہوگا، کیوں نہ اسے ابھی سے کچل دیا جائے" ؟
"اوتھوں ہوں ۔" ایک نے بیچ میں دخل دیا ۔ جس کا بیج ہے' اُس سے نمٹا جائے اس کا کیا ہے ۔"
تیسرا بولا ۔
"سالا ہریجن نیچ ذات ہوکر پوجا کے پھول بیچتا ہے ۔ بھگوان کی مورتی ناپاک نہ ہوگئی ہوگی اُس کی بلی ہی کیوں نہ دے دی جائے کہ بھگوان خوش ہو جائیں ۔"
ذرا پڑھے لکھے ایک صاحب بولے ۔ "مگر اس کو پھول بیچنے کا آئیڈیا آیا کیسے ۔ ؟"
"کیوں بے ۔ تجھے پھول بیچنے کو کون بولا ۔" ؟
ایک نے بندو کی گردن دبائی جو آگے ہی چوہا بنا کھڑا ہر ایک کی رنگ رنگ کی بولی سُن رہا تھا ۔ وہ کچھ نہ بولا تو ایک نے پیچھے سے دھوکا جڑا ۔ "ابے بول ۔"
اُس نے اپنے خالی پیٹ کو تھپ تھپایا ۔
"سالا ہیرو بنتا ہے ۔ کوئی بولا ۔ پیٹ بجا کر بتا رہا ہے منہ سے نہیں بول سکتا ۔"

مقدمہ زمیندار کی عدالت میں پیش ہوا ۔ بڑا نرم فیصلہ سنایا گیا ۔
"جب تک باپ کا دباؤ اولاد پر نہ پڑے اولاد نہیں سُدھر سکتی ، اس لئے باپ کی ہی

تنبیہہ ہونی چاہیئے۔ پہلوان ـــ زمیندار نے اپنے ایک سنڈے کی طرف اشارہ کیا ـــ کلّو کو اپنی چارپائی کے نیچے ایک گھنٹے کے لئے سلا دو ـــ

بہتر ہے سرکار ـــ پہلوان سعادت مندی سے بولا ـــ پھر سب کے سامنے ایک مضبوط پایوں والی چارپائی لائی گئی ـــ کلّو کو زمین پر چت لٹا کر دو پائے ہتھیلیوں پر اور دو پاؤں پر رکھے گئے۔ اور دھم سے پہلوان چارپائی پر جا کودا ـــ

" ارے مرگیا ـــ ارے مرگیا ـــ" چاروں پائے پہلوان کے وزن سے اس کی ہتھیلیوں اور پاؤں کو پیسنے لگے اور کلّو دہائیاں دینے لگا ـــ

بندو نے اپنا غصّہ اور ابال روکنے کو اتنی زور سے اپنی مٹھیاں بھینچیں کہ اس کے ناخن ہتھیلیوں میں گڑ گئے۔ اور باپ بیٹے دونوں کی ہتھیلیاں مہندی سے رنگ گئیں ـــ

کئی دنوں تک دونوں کے ہاتھوں کے زخم ہرے رہے ـــ کلّو پھر بھی کام پر جاتا رہا ـــ بندو کا دل رفتہ رفتہ زندگی اور اس ماحول سے اچاٹ ہوتا جا رہا تھا۔ ماں سے وہ عجیب عجیب انہونی باتیں کرتا ـــ ایسی باتیں جنھیں سن کر ماں اس کا منہ اپنے ہاتھوں بند کر دیتی ـــ پاٹھ شالہ سے آکر وہ یوں ہی اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا ـــ ایک دن وہ تالاب والے رامو چاچا کے ہاں جا نکلا ـــ وہ بھی ہریجن ہی تھے۔ بڑی محبت والے ـــ یا کم سے کم بندو یہی سمجھتا تھا ـــ وہ گیا تو دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ چاچی تو کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھیں اور رامو کاکا اپنی چھوٹی بیٹی کو گود میں لئے اس کے پاؤں پڑھے کرتا بیٹھا تھا اور بچّی تھی کہ چیخ چیخ کر روئے جا رہی تھی ـــ

"کاکا — یہ تم کیا کر رہے ہو؟ —" بندو کچھ سہم کر بولا —

"کچھ نہیں بٹیا — ذرا بس اس کے پاؤں ہی تو ٹیڑھے کر رہا ہوں —"

وہ مزید پٹیاں کستے ہوئے بولا "دیکھ اتنے دن کی کوشش اب ذرا کچھ کامیاب ہو رہی ہے۔"

"مگر کیوں کاکا —" اب کے ذرا غصّے سے بولا۔

"ارے بٹیا۔ بڑی ہو کر بھی کیا کرے گی — پہلے تو بیگار بھرے گی — تیرے میرے گھر کام کرے گی —" پھر اس سے بے خبر کے سننے والا بارہ تیرہ برس کا چھوکرا ہے کہے گیا —" پھر اس کے بستر سے اُس کے لبتر ہیں۔ اور آخر میں وہی کیڑے مکوڑوں کی زندگی — تو بٹیا اس سے اچھا ہے کہ معذور کر کے ڈال دو کہ کوئی بھی ترس کھا کر ایک دو سکّے پھینک دے —"

بندو رامو کاکا کے چہرے کو دیکھے گیا — دیکھے گیا — پھر دھیرے دھیرے بولا۔ "یہ دُنیا میں امیر لوگ کہاں سے پیدا ہو گئے —"

وہ ہنسا —" ارے بٹیا جتنے امیر لوگ ہیں نا۔ یہ سب غریبوں کا پیسہ چھین چھین کر امیر ہو گئے ہیں —"

"مگر کاکا اِن لوگوں کے پاس تو پیسہ تھا ہی نہیں۔ پھر چھیننے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے — ہو نہ ہو یہ خرابی بھگوان کی ہے —"

لڑکی بری طرح روئے جا رہی تھی — کاکا تو رسے آخری پٹی لپیٹتے ہوئے بولا —" بھگوان کی ہو یا انسان کی — بٹیا اصل میں یہ سوال ایسا ٹیڑھا ہے کہ بھگوان خود بھی حل نہیں کر سکتا —"

بندو کا دل جیسے ننھی بچی کی پٹیوں میں خود بھی جکڑ کر رہ گیا —

اُس دن تالاب کے پاس والے میدان میں چند لڑکے مل کر گلّی ڈنڈا کھیل رہے تھے کہ بندو بھی جا نکلا ـــ سب اونچی ذات والوں کے لڑکے تھے۔ زمیندار کا بیٹا بھی ان میں موجود تھا ـــ سب کو پتہ تھا کہ بندو گلّی اڑانے میں طاق ہے اُسے دیکھ کر ذرا سمٹ سے گئے ـــ

اے بُندو ـــ داؤ دیگا ـــ" ایک لڑکا خوش دلی سے پکار کر بولا ـــ

"مگر بے ایمانی نہیں کرنا ـــ ہاں ـــ" بندو بولا ـــ

زمیندار کا بیٹا اُسے غصّہ سے دیکھ کر بولا ـــ

"تم لوگ اس کے ساتھ کھیلوگے ـــ ؟ ڈیڈی منع کرتے ہیں ـــ یہ نیچ ذات کے لوگ۔ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چاہیئے نہ کھیلنا ـــ"

بندو کا منہ اُتر گیا ـــ دوسرا بولا ـــ

"ارے یار کھیل میں کیا ہرج ہے۔ ہم کوئی اس کے ساتھ کھا پی رہے ہیں ـــ؟"

چھوٹے سرکار بولے ـــ "نہیں نہیں اُس کے ہاتھ کی چھوئی گلّی ہم چھوئیں گے تو ہم اور ہمارا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا ـــ دادی ماں نے منع کیا ہے ـــ"

بندو یونہی کھڑا رہ گیا ـــ کسی لڑکے نے گلّی کو جو ڈنڈا رسید کیا تو وہ دور میدان میں جا گری۔ چھوٹے سرکار بولے ـــ

"اے بندو بہت دور گلّی جا کر گری ہے کون جائے ـــ تو ہی دوڑ کر اٹھا لا۔"

"بندو ڈھٹائی سے بولا ـــ اب میں اٹھا کر لاؤں گا تو گلّی ناپاک نہیں ہو گی ـــ کھیلتا تو تم اور تمہارا دھرم بھرشٹ ہو جاتے ـــ ؟"

"حرام زادے زبان چلاتا ہے ـــ" اور ایک کرارا چانٹا اس کے گال پر پڑا۔

ایک ہاتھ گال پر رکھ کر بُندو سیدھا چھوٹے سرکار کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا

بولا ـــ" زمیندار کے بیٹے ـــــ میری ماں کہتی ہے کبھی بھی کسی سے قرض لو تو اُسے واپس کر دیا کرو۔ آج میں تمہارا یہ قرضہ سنبھال کر رکھ رہا ہوں ـــ کسی دن تمہیں ضرور واپس کروں گا ـــــ اور دُگنا تگنا کر کے ـــ واپس کروں گا ـــ

چاول اُن دنوں سونا ہوا جا رہا تھا ـــ ویسے تو ہوش سنبھالنے پر بندو نے سدا جواری کی روٹی ہی کھائی تھی۔ سالن کی لگا دن تو کم ہی نصیب ہوتی تھی۔ ہاں پیاز نمک اور مرچ ضرور مل جایا کرتی تھی۔ زندگی میں تینوں بھائی بہنوں نے کبھی کبھار ہی چاول دیکھے تھے۔ وہ بھی جب بڑے اور اونچی ذات کے گھرانوں میں کسی کی شادی یا موت ہوتی اور نیچ ذات والوں کو پُن کمانے کی خاطر کھلایا جاتا تب ـــ

فصلیں کٹ کر گھر میں آرہی تھیں۔ بڑی چوکسی سے اناج کی صفائی ہوتی اور سال بھر کے لئے گوداموں میں اسٹور کروایا جاتا ـــ ایک دن بہت رات بڑے بھی باپو گھر نہ لوٹا تو محبت کا مارا بندو باپ کی خبر لینے ماں کی چوری سے حویلی جا پہنچا ـــ مگر دور ہی سے، جھاڑی کی آڑ سے ـــ دیکھتا رہا۔ پہلے تو اُس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ آیا یہ کیا ماجرا ہے پھر ذرا غور سے دیکھا تو کچھ بات پلّے پڑی ـــ

باپو کے دونوں پیروں میں موٹی موٹی زنجیریں بندھی ہوئی تھیں اور زنجیروں کے ساتھ بڑے بڑے دو پتھر گھسیٹتے ہوئے چلتے ـــ یہ تو اُس نے دیکھ لیا کہ پتھر بندھے ہوئے ہیں، مگر کیوں بندھے ہوئے ہیں یہ وہ نہ سمجھ پایا۔ اور باپو ایسا بے زبان جانور تھا کہ باہر کی بات گھر میں آکر بولتا ہی نہ تھا ـــ بس کام سے آئے، منہ ہاتھ دھوئے ـــ کھانا کھایا اور کبھی ٹانگیں دے کر سو رہے۔

ـــ ختم ـــ صبح ہوئی پھر وہی پرانا چکر ـــ

آس پاس کچھ کھٹر پٹر ہوئی تو بُندو بندر کی سی پھرتی سے جھاڑ پر چڑھ گیا۔

ـــ زمیندار کا منشی آیا ـــ پھر ایک ایک پر گرجا برسا۔ سب کا حساب کتاب صاف کیا ـــ پھر ایک نوکر کو بلا کر کہا ـــ "کلّو کی تلاشی لے کر چاول باندھ کر کہیں کھٹر پٹر میں چھپا تو نہیں رکھے ـــ"

جب نوکر تلاشی لے کر بول چکا کہ اُس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ تو اسے حکم ملا کہ اب گھر جائے ـــ

کلّو مسمسی سی صورت بنا کر آگے کی اُور جھکا اور منشی کے پیر چھو کر بولا۔

" مائی باپ ـــ میں تو برسوں کا پرانا نمک کھانے والا آدمی ہوں ـــ اب بھی مجھ پر بھروسہ نہیں۔ روز وزنی زنجیریں اور پتھر باندھنے سے میرے ٹخنے اور پیر چھل گئے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں حضور میں چاول کا ایک دانہ بھی کبھی گھر نہیں لے جاؤں گا اگر یہ سزا ختم کر دیں ـــ"

" ابے چل چل ـــ ہم نے کئی ایسے شاطر چور دیکھے ہیں جو طرح طرح سے چوری کرتے ہیں اسی لئے سرکار نے یہ طریقہ ایجاد کیا ہے ـــ زنجیر پیروں میں بجتی بھی ہے اور پتھروں سے بندھی ہونے سے وزنی بھی ہو جاتی ہے تو کوئی بھاگ نہیں سکتا۔ چوری نہیں کر سکتا۔ سمجھا حرام خور......

کلّو سر جُھکا کر رہ گیا ـــ بندو کا سارا خون اس کی آنکھوں میں اتر آیا ـــ مگر قدرت کلّو پر مہربان تھی۔ اس رات موت نے ایسی زنجیر اس کے پیروں میں باندھی کہ زندگی پھر اُسے کبھی گھسیٹ نہ سکی ـــ

اور وہ دن ایک ایسا دن تھا جس دن زندگی نے ایک نیا موڑ لیا ـــ !

برسات کا مہربان پانی بنجر اور زرخیز زمین دونوں پر ایک ساتھ برستا ہے ــــ غریب ہو یا امیر، جوانی ہر ایک کے چہرے پر بغیر تخصیص گلال بکھیر دیتی ہے ــــ

بندو تینوں میں سب سے چھوٹا تھا ــــ دونوں بہنیں ابھی اتنی بڑی تو نہ تھیں لیکن غریبی کی مشقت کچھ جلد ہی ہاتھ پاؤں کھول دیتی ہے ــــ تانی بڑی تھی اور رجّی چھوٹی ۔ دونوں جنگل سے لکڑیاں کاٹنے جاتی تھیں ۔ پھر لدوا کر لاکے محلّے گاؤں میں، ہاٹ بھرتا تو اور دوسری پرچھیں عورتوں کی طرح طرح بیچنے آتی تھیں ــــ

اُس دن بندو تانی اور رجّی کے ساتھ لکڑیاں کاٹنے گیا ہوا تھا ــــ کلہاڑی لے کر وہ جھاڑ پر چڑھا ہوا تھا ۔ نیچے تانی اور رجّی لکڑیاں جمع کر رہی تھیں ۔ لکڑیاں بہت سی جمع ہو گئیں تو رجّی بولی ۔ "اتنی لکڑیاں تو ہم سے اٹھیں گی نہیں میں اماں کو بلا کر لاتی ہوں ــــ"

رجّی کے جانے کے بعد ہی ٹپر ٹپر گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں اور عین اس جھاڑ کے نیچے گھوڑا آ کر ٹھہر گیا ــــ گھوڑے پر زمیندار بیٹھا ہوا تھا ــــ

تانی کو دیکھ کر زمیندار یونہی بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا ۔ اس کی آنکھیں مارے ہوس کے پھیل کر رہ گئیں ۔ تانی ایک انجانے خوف کے مارے ہٹتے ہٹتے جھاڑ کے تنے سے جا لگی ــــ ماحول کا تناؤ کم کرنے وہ ڈری ڈری سی آواز میں یونہی بولی ــــ

"م ــــ م ــــ میں لکڑیاں سمیٹنے آئی ہوں ــــ"

زمیندار ایک مکاری ہنسی ہنس کر بولا ــــ "ہم بھی تو کچھ سمیٹنے ہی یہاں رُکے ہیں" پھر وہ گھوڑے سے نیچے اتر آیا ــــ جانے کتنے لمحے یونہی شکاری اپنے شکار کو تکتا رہا کہ دور سے کسی کو آتا دیکھ کر تانی ذرا جرأت پا کر چلّائی ــــ

"ماں ــــ"!

رکمنی تیز تیز قدم اٹھاتی آئی اور قریب آکر ٹھٹھک کر رہ گئی ــــ رتی بھی یونہی سہمی کھڑی رہ گئی۔ زمیندار نے پلٹ کر دیکھا اور ہنس کر بولا ــــ

"جوان جوان چھوکریوں کی ماں بھی اتنی جوان اور دلکش ہو سکتی ہے ــــ؟ واہ بھئی واہ۔ تو پھر پہلے شاخ کاہی حساب صاف کرلیں ــــ ٹہنیوں سے بعد میں نپٹتے رہیں گے ــــ"

جیسے ہی زمیندار نے رکمنی کی ساڑی کا پلو کھینچا۔ اوپر بندو نے اور نیچے لڑکیوں نے منہ پھیر لئے ــــ ماں چیخی چلّائی ــــ

"بھگوان کے لئے مجھ پر رحم کرو ــــ میری جوگی پر ترس کھاؤ ــــ میرے اپنے بچّوں کے سامنے مجھے ننگی نہ کرو ــــ"

لیکن شیطان آج ساری رسیاں تڑا چکا تھا ــــ ماں سے نپٹ کر وہ تانی کی طرف مڑا ــــ اسے ایک بیل کی طرح اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈالا اور گھوڑے پر بیٹھا، یہ جا وہ جا ــــ چھو ہو گیا ــــ

کتنا عجیب حادثہ تھا ــــ وہ اوپر بیٹھا دیکھتا رہا ــــ ہاتھ پیروں میں ہلنے بھر کی بھی سکت نہ رہ گئی تھی ــــ ماں پھر دھیرے دھیرے اٹھی ــــ اپنے کپڑے برابر کئے۔ چھوٹی بیٹی کا ہاتھ پکڑا ــــ سامنے والے کنوئیں کی گگر پر رکی اشارے سے بیٹی سے کہا ایک ڈول پانی کھینچ ــــ جب وہ پانی کھینچنے کو جھکی تو اسے دھکّا دے کر کنوئیں میں گرا دیا اور دوسرے ہی لمحے خود بھی کنوئیں میں کود پڑی ــــ

دوسرے دن گاؤں کے ایک اور کنوئیں سے تانی کی بھی لاش ملی ــــ

پتہ نہیں زمیندار نے ڈلوا دیا تھا یا وہ غیرت کے مارے خود ہی کود گئی تھی۔
لیکن جب اس سے رامو کاکا نے روتے روتے پوچھا تھا ——
بیٹا تیرا تو سب گھر بار ہی ایک ساتھ اُجڑ گیا۔ ماں بھی دونوں بہنیں بھی۔
اب تو کہاں جائے گا ——"
تو وہ پاگلوں کی طرح منہ اٹھائے تکتا رہا ——
لیکن اس رات جب سارا گاؤں نیند کے مزے لوٹ رہا تھا — وہ ہر قسم کے ڈر سے، خوف سے بے پرواہ منہ اُٹھا کے ایک طرف چل دیا ——
جہاں بھی قسمت لے جائے —— !

شہر نے بھی اُس سے کوئی بہت خوبصورت سلوک نہیں کیا —— فاقے دھکے، جوتے ہر ذلت اس کا مقدر بنی ساتھ پھرتی رہی —— مگر گاؤں میں ہر جگہ جو اچھوت اور ہریجن کہہ کہہ کر اُسے اس کے ماں باپ اور گھر والوں کو دھتکارا جاتا تھا، اس سے کسی حد تک یہاں چھٹکارا مل گیا تھا، کیونکہ اتنے بڑے شہر میں کون کسے پہچاننے اور پوچھنے چلا تھا —— لیکن اچھوت ہونے کی جو چھاپ اُس کے ماتھے اور زندگی پر لگ چکی تھی وہ اُسے دھو دینا چاہتا تھا —— تو وہ کم عمر لیکن یہ بات اُس نے اچھی طرح جان لی تھی کہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا روگ ہی یہ تھا کہ وہ اچھوت تھا —— اور اب اُس نے اپنے آپ کو جتا دیا تھا کہ بیٹا اگر کہیں بھی، کوئی بھی تم سے پوچھے کہ تم کون ہو تو صاف کہہ دینا کہ میں برہمن ہوں۔
—— نام بدلنے کو کون سے ہاتھی گھوڑے لگتے ہیں" —— ؟ کوئی تمہارے اندر تو جھانک کر نہیں دیکھتا نا کہ تمہاری ذات کیا ہے۔ ؟

۲

اور اُس دن سے اُس نے اپنا چلن سا بنالیا — چلتے پھرتے سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے بس ایک سبق اپنے آپ کو سکھائے جاتا —

"میں اچھوت نہیں ہوں"۔

"میں اچھوت نہیں ہوں"۔

"میں اچھوت نہیں ہوں —"

وقت کے نقارے پر کچھ اور چوٹیں پڑیں اور دنیا میں دیکھے جانے والے چند اور ایسے خوابوں کا اضافہ ہو گیا جن کی کوئی خوبصورت تعبیر نہیں ملتی — اندھی آنکھوں کے بے رنگ خواب — جلتی جوانی کے ننگے خواب —!

یہ آنکھیں بندو کی آنکھیں تھیں — جو خواب ویسے بھی کم دیکھتی تھیں اور اپنے اِرد گرد پھیلی ہوئی ناانصافی زیادہ —

بہت دنوں سے وہ قلی، مزدوری، بھاڑا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے بیزار سا ہو گیا تھا، کیونکہ شہر کی بات اور اصول — ہر جگہ اپنے اپنے آدمی لگے رہتے تھے — نئے آدمی کو گھسنے نہیں دیا جاتا تھا۔ اسی لئے کچھ دنوں سے وہ ایک ہاتھ گاڑی والے کے ساتھ لگ گیا تھا — وزنی وزنی بوجھ ڈھوتے اس کی کمر ٹوٹنے لگتی — آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگتا، لیکن وہ جئے جا رہا تھا جتنے پیسے ملتے وہ اپنی ڈاب میں سنبھال کر رکھ جاتا — بھوک بہت زور کرتی تو چند پیسوں کے چنے پھانک لیتا! سستے قسم کی ہوٹل میں کم سے کم پیسوں میں پیٹ کی دوزخ بھر لیتا —

ایک دن وزن کی زیادتی اور بھوک کے غلبے نے ایسا زور کیا کہ وہ چکرا کر گر پڑا۔ اسے پتہ نہیں بعد میں کیا ہوا کیونکہ وہ بے ہوش ہو چکا تھا ـــــ لیکن ہوش آیا تو خود پر ایک بہت بوڑھے اور مہربان چہرے کو جھکا پایا ـــــ

"شکر ہے تم ہوش میں آ گئے بیٹا ـــــ" وہ اجنبی بوڑھا خوش ہو کر بولا۔ میں تو گھبرا ہی گیا تھا ـــــ تم کون ہو بیٹا ـــــ کہاں کے رہنے ....." لیکن بوڑھے کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ تیزی سے بول اٹھا ـــــ

"میں اچھوت نہیں ہوں ـــــ"

بوڑھے نے حد درجہ حیرت سے اُسے دیکھا ـــــ دیکھتا ہی گیا ـــــ اچانک بندو کو احساس ہوا کہ وہ غلط جگہ غلط جواب دے گیا ہے ـــــ کچھ شرمندہ سا ہو کر بولا۔

"میں ایک مزدور ہوں بابا ـــــ مگر آپ کون ہیں ـــــ"

"میں ایک بڈھا ہوں بیٹا ـــــ" بوڑھا نرمی سے ہنسا ـــــ" اور بوڑھے جب اور بوڑھے ہو جاتے ہیں اور کسی بے سہارا کو سڑک پر بے ہوش دیکھ لیتے ہیں تو اسے اپنا بیٹا بنا لیا کرتے ہیں ـــــ"

یہ محبت ـــــ یہ خلوص ـــــ یہ انسانیت تو اُسے زندگی میں آج تک کبھی نہیں ملی تھی۔ یہ فرشتہ کون تھا جو اتنے سالوں اس کی زندگی سے دور رہا تھا۔ ـــــ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا ـــــ وہ اس محبت بھری شخصیت سے لپٹنے کو بے قرار اٹھا کچھ آگے بھی بڑھا لیکن اس صاف ستھرے بوڑھے کو دیکھ کر اس نے اپنے میلے کچیلے وجود کو دیکھا اور ٹھٹھک کر رہ گیا ـــــ

بوڑھا اچانک اٹھا اور اسے گلے لگا کر محبت سے بولا ـــــ" تن کا میل کوئی چیز نہیں ہے بیٹا بڑی بات یہ ہے کہ من میلا نہ ہو ـــــ"

زندگی میں پہلی بار چوبیس سالہ بندو بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا ــــ

بوڑھے بابا نے سڑک سے اسے بے ہوشی کی حالت میں اٹھایا تھا اور واقعی بابا نے اُسے ہوش عطا کر دیا ــــ بابا کے ساتھ رہ کر اس نے زندگی کا صحیح روپ دیکھا۔ نیکی اور انسانیت کی صحیح اقدار کو پرکھا ــــ وہ اکثر سوچتا: "زندگی میں مجھے بابا نہ ملتے تو میں کتنا ادھورا بکھرا بکھرا اور ٹوٹا ہوا رہتا ــــ"

بابا جب کبھی نماز پڑھتا، جب کبھی قرآن شریف پڑھتا اور بیحد عجز و انکساری سے خدا کے حضور گڑگڑاتا، بندو اسے سخت حیرت اور تعجب سے دیکھتا ــــ دیکھے جاتا ــــ "بابا ــــ" ایک دن وہ بولا ــــ "میں نے آپ سی کوئی شخصیت نہیں دیکھی"

بابا نے قرآن شریف جزدان میں لپیٹ کر رکھا اور مسکرا دیا ــــ جیسے پوچھتا ہو ــــ ایسی کیا انوکھی بات ہے مجھ میں ــــ؟

"بابا میں سمجھتا ہوں کہ ہم انسان ــــ عبادت کو بطور سکّے کے استعمال کرتے ہیں۔ ہم عبادت اور پوجا اسی لئے تو کرتے ہیں کہ جواب میں ہمیں خدا، بھگوان جو مانگیں دے دیتا ہے۔ جیسے کسی بھی دوکاندار کو آپ سکّہ دے کر کوئی سی چیز خرید لیتے ہیں۔ اسی طرح ہم عبادت اس لئے نہیں کرتے کہ ہمیں اوپر والے سے کوئی لگاؤ یا محبت یا عقیدت ہے، بس دین لین کا سا معاملہ ہے ــــ وہ ہنسا ــــ لیکن بابا آپ ..... آپ عبادت کو صرف عبادت سمجھ کر ادا کرتے ہیں ــــ میں نے آپ کو بدلے میں خدا سے کچھ مانگتے نہیں دیکھا ــــ"!

بابا نے ہنس کر اسے دیکھا ــــ "خدا ہمیں کچھ نہ دے، تو بھی کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ جتنی بھی دیر ہم خدا کے حضور میں رہتے ہیں اُس سے قریب رہتے ہیں ــــ"!!

بابا ـــ لرزتی ہوئی آواز میں بندو بولا ـــ" میں نے نہ کبھی مندروں میں جھانکا نہ بھگوان کی مورتیوں کو ہی دیکھا ـــ لیکن اب کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو..... آپ کو..... آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا ـــ

کئی بار آنسو بھی تو زبان کا حق ادا کر دیتے ہیں ـــ ؟

بندو کو بابا اپنے ہی جھونپڑے میں اٹھا لائے تھے ـــ بندو کو سخت شرم آتی تھی کہ بوڑھا بابا خود ہی گھر کا سارا کام کرتا، کھانا بھی پکاتے اور ایک ماں کی طرح کھانا پروس کر بندو کو آواز دیتے ـــ

" میاں پہلے کھانا کھالے ـــ پڑھائی لکھائی بعد میں ہوتی رہے گی ـــ"

حد یہ کہ سارا خرچہ وہی اٹھا رہے تھے ـــ

دن بھر بندو لوہے کا بھنگار کچرا، ہاتھ گاڑی میں اِدھر سے اُدھر کرتا رہتا ۔ رات کو کام سے لوٹتا تو خالی وقت میں پڑھتا رہتا ـــ اپنے تکلیف دہ بچپن کی یادوں میں سب سے تلخ یاد اس کے ذہن کو یہ ڈستی تھی کہ وہ اچھی طرح تعلیم بھی حاصل نہ کر سکا تھا ـــ

دو دن پہلے انگلی پر ہتھوڑی لگ جانے کی وجہ سے بابا کے ہاتھ پر سوجن آگئی تھی اور بندو سخت شرم محسوس کر رہا تھا کہ اس حالت میں بھی بابا ہی کام کریں۔ ـــ وہ مستعدی سے جتا ہوا تھا۔

" بابا آج آپ میرا کمال دیکھئے ـــ ایسی بڑھیا روٹی کھلاؤں گا کہ بس ـــ"

اس نے پتیلی میں آٹا نکال کر بھر لوٹا پانی اس میں جھونک دیا اور بیحد پریشان ہو گیا کہ پتیلی سے آٹا تو جانے کدھر غائب ہو گیا تھا صرف پانی ہی پانی موجیں مار رہا تھا ـــ بابا بڑی سنجیدگی سے بولا ۔

" میاں میرے خیال سے تم پھر بہت اچھی پکا لیتے ہو گے ۔"
بندو پہلے تو تھوڑی دیر سر کھجایا کیا اور پھر کتاب اس طرح لیکر بیٹھ گیا کہ کتاب سے اس کا چہرہ چھپ گیا۔ بابا مسکرا مسکرا کر اسے دیکھتا اور اپنا کام کرتا رہا ۔ بڑی دیر بعد بندو بولا ۔

" بابا اب بہت جلد میں بھی امیر بن جاؤں گا اور سب سے پہلے کھانا پکانے کے لیے ایک نوکر رکھوں گا ۔"

" انشاء اللہ " ۔ بابا نے بہت دل جمعی کے ساتھ کہا ۔

" ہاں ہاں انشاء اللہ کہنا میں بھول گیا تھا ۔
انشاء اللہ ۔ انشاء اللہ ۔ .... کچھ دیر رک کر وہ بولا ۔ " مگر بابا ایک بات ہے۔ آپ نے بتایا تھا کہ انشاء اللہ کا مطلب ہے اللہ نے چاہا تو ...... تو اگر کبھی اللہ میاں کا موڈ بدل گیا اور اُن کا دل چاہے ہی نا، تو پھر اپن امیر کیسے نہیں گے بابا؟
بابا ہنس پڑا ۔ بڑے پیار سے بولا ۔ " ارے دیوانے اللہ میاں نے قرآن شریف میں وعدہ فرمایا ہے کہ " ہم محنت کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے " یعنی جو محنت کریگا اس کا پھل اُسے ضرور دیں گے، تو تو جو دن رات محنت کر رہا ہے تو کیا یہ یونہی رائیگاں چلی جائے گی ۔ "؟
اک دم بندو تیزی سے اٹھا اور اوپر ٹکڑے کی چٹی پر رکھی ہوئی اپنی پوٹلی نکال کر بابا کے پاس آکر بیٹھ گیا ۔

" بابا دیکھئے اب تو کافی روپے جمع ہو گئے ہیں، کل ہی گِن کر رکھے ہیں۔ ۔ پورے دو سو چودہ ہیں۔ اب اس سے ایک زوردار بزنس شروع کر دینا چاہیئے"

" ہاں بیٹا میں بھی یہی کہنے والا تھا کہ سب سے اچھی روزی خود مختاری کی۔

بھلا کب تک دوسروں کے بوجھے ڈھوتا رہے گا۔ ایسا کر تو قسطوں پر ایک ہاتھ گاڑی خریدلے اور یہاں وہاں سے لوہے کا کچرا ٹکڑا ٹوٹا خرید کر، اچھے داموں بیچنا شروع کردے ــــ"

بندو بُرا مان گیا ــــ" ارے واہ بابا آپ نے بھی خوب بزنس بتایا۔ پرسوں ہی میں نے یہ نیا شرٹ اور نئی لنگی خریدی ہے، اس نئے جوڑے کو پہن کر بھی میں ہاتھ گاڑی گھسیٹوں اور لوہے کا کچرا جمع کرتا پھروں ــــ"؟

"میاں ــــ!" بابا نے بیحد نرمی سے سمجھایا ــــ کوئی بھی دھندہ حقیر نہیں ہوتا۔ مجھے دیکھو جوتے گانٹھتا ہوں ــــ موچی بابا کہلاتا ہوں۔ اس سے کیا میری ذات گھٹ گئی..... بابا یہ خیال تو میرے دل میں بھی پہلے کئی بار آیا تھا ــــ کہنے کی ہمت نہ پڑی کہ آپ کو جوتے گانٹھتے بُرا نہیں لگتا ــــ"؟

بابا نے سر اٹھا کر ترس بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔

"اچھا ہی ہے نا بیٹا، جوتے ہی تو گانٹھتا ہوں نا؟ لوگوں کے پیروں پر ہی نظر رہتی ہے نا ــــ؟ جو کام کسی فرد کو بھی پسند ہے، تم نے دیکھا ہوگا، سبھی آنکھیں اور منہ تو اونچائی پر ہوتے ہیں۔ مگر عقیدت کے اظہار کے لئے چھوا قدموں ہی کو جاتا ہے۔ بندو کچھ نہ بولا بڑی عقیدتمندانہ نظروں سے بابا کو دیکھے گیا ــــ" اور بیٹا لوہے کا دھندہ کرنے کو اس لئے کہتا ہوں کہ خدا نے فرمایا ہے کہ ہم نے تمہارے لئے لوہے میں بہت سے فائدے رکھے ہیں ــــ"

بندو ہنس کر بولا ــــ" بابا آپ نے مجھے آدھا مسلمان تو کر ہی دیا ــــ چلئے آپ کی یہ بات بھی مانے لیتے ہیں ــــ"

یہ حقیقت ہے کہ خدا محنت کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے ـــــ میلی لنگی پھٹے شرٹ میں دھاروں دھار پسینے میں ڈوبے ڈوبے ہاتھ گاڑی چلاتے ہوئے بندو نے ترقی کی ایک اور منزل سر کر لی ـــــ ایک جگہ جھگا رمیں سستے داموں بہت سا لوہا مل گیا۔ ان دنوں لوہے کا بھاؤ نیچا جا رہا تھا ـــــ بابا نے ہی مشورہ دیا کہ جھونپڑے کے سامنے والی خالی زمین میں مال خرید خرید کر جمع کرتے جاؤ۔ جب بھاؤ اونچا جائے تب نکال دینا ـــــ ایک ہی ہلّے میں بندو کے پاس ہاتھ گاڑی سے تین پہیوں والا ٹمپو آ گیا ـــــ لنگی پتلون سے بدل گئی اور چہرے چہرے سے اسے دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ کسی نیچ ذات کا آدمی ہے ـــــ

بندو نے بابا کا ساتھ پھر بھی نہ چھوڑا ـــــ

"بابا ـــــ ٹمپو میں بیٹھا ہوا میں کیسا لگتا ہوں ـــــ"؟ اس دن بندو نے ذرا شرارت سے اکڑ کر بابا سے پوچھا ـــــ

"میاں ـــــ بس خدا کا شکر ادا کیا کرو ـــــ وہ جسے چاہے عزت دے ـــــ"

بندو ٹمپو سے کود کر اترا بابا کے گلے سے بچوں کی طرح جھول گیا ـــــ

"بابا تین سالوں کی محنت ہی میں ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے ـــــ بابا اب اپن ایک اچھا والا گھر لیں گے ـــــ"

بابا نے ہاتھ اٹھا کر انکاری انداز میں سر ہلا دیا ـــــ

"اپن نہیں ـــــ تم ـــــ"

"ارے واہ بابا ـــــ بندو روہانسا ہو گیا۔ آپ کے بغیر نیا گھر تو کیا میں سورگ میں بھی نہ جاؤں۔"

بابا اسے پیار سے اپنے بازو میں بٹھاتے ہوئے بولا ـــــ

دیکھ بیٹیا ـــ میں بڈھا آدمی اسی کونے میں اللہ اللہ کرتا ٹھیک ہوں ـــ تو جوان آدمی ہے نیا گھر بسے، چار دن کو اللہ موٹر دیگا۔ شادی کرنا۔ بال بچے ہوں گے ـــ میں یہیں سے تیرے لئے بیٹھے بیٹھے دعا کیا کروں گا ـــ"

بابا دور اشارہ کر کے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا ـــ "یہاں رہوں گا تو دل کو یہ تسلی رہے گی کہ اپنی سکینہ سے قریب ہوں ـــ وہ قبر میں سہی، مجھے لگتا ہے مجھ سے قریب ہے۔ ہر بُرے وقت میں دکھ میں، آنسوؤں میں اس نے میرا ساتھ دیا ہے ـــ بس زندگی بھر اولاد کے لئے ترستی رہی ـــ آج تو وہ بھی دیکھتی ہوگی کہ اللہ نے نہ صرف میری بلکہ اس کی بھی گود بھر دی ہے ـــ" اس نے زور سے بندو کو گلے سے لگا لیا ـــ

"اب آخری وقت میں اسے کیا چھوڑوں گا بیٹیا ـــ ویسے میں تیرے پاس آتا جاتا تو رہوں گا ہی ـــ" وہ ہنسنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا ـــ

"بابا ـــ" بندو ڈرتے ڈرتے بولا ـــ "میں ماں کی قبر پر پھول ..... پھر وہ اچانک چپ رہ گیا ـــ

"ہاں ہاں کیوں نہیں ـــ بابا آنسو پونچھ کر بولا ـــ اسمیں پوچھنے کی کیا بات ہے.... "بابا ـــ وہ زور سے چیخ مار کر بابا سے لپٹ گیا ـــ میں آج آپکے سامنے اپنی زندگی کا ہر ہر ورق کھول کر رکھ دوں گا ـــ آپ اتنے مہان ہیں اتنے عظیم ہیں کہ آپ سے کوئی بھی بات چھپانا گناہ ہوگا ـــ جرم ہوگا ـــ بابا ـــ بابا ـــ وہ ذرا شانت ہو کر بولا ـــ" میں ـــ میں اچھوت ہوں"!!

بابا نے اُسے بے حد حیرت سے، بڑے اچنبھے سے دیکھا ـــ پھر سر ہلا کر بولا۔ "تو اس سے فرق کیا پڑتا ہے ـــ"؟

بندو پاگلوں کی طرح دونوں ہاتھ ہلا کر بولا ـــــ
" تو بابا آپ کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ـــــ "؟ پھر وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگا ـــــ " ارے بابا آپ بالکل بھولے ہیں اس سے بہت فرق پڑ جاتا ہے بابا ـــــ " جب کوئی انسان اچھوت بن کر پیدا ہو جاتا ہے نا بابا۔ تو اس کے لئے مندر کے دروازے بند ہو جاتے ہیں ـــــ کنوئیں کا پانی اس کے لئے حرام ہو جاتا ہے ـــــ چوری نہ بھی کرے تو اس کے پیروں میں موٹی موٹی زنجیریں باندھ دی جاتی ہیں ـــــ اور بابا اور تو اور کمر سے جھاڑو باندھ دی جاتی ہے کہ پاک دھرتی پر ناپاک قدموں کے نشان پڑ بھی جائیں تو مٹتے جائیں......

بابا حیرت سے بندو کو دیکھ رہا تھا۔ جو ہانپے جا رہا تھا۔ مگر مسلسل بولے جا رہا تھا۔
" بابا آپ کو نہیں پتہ اچھوت کے ہاتھ کی چھوئی ہوئی ہر چیز نجس، ناپاک اور گندی ہو جاتی ہے ـــــ لیکن بابا مزے کی بات یہ ہے کہ ہماری عورتوں کو ہماری ماؤں بہنوں کو چھونے سے وہ لوگ ناپاک نہیں ہوتے......

بابا نے اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا ایک کٹورہ اس کے منہ سے لگا دیا۔ پھر بندو نے اپنے ماضی کی ایک ایک چھوٹی سے چھوٹی واردات بابا کے سامنے کھول کر رکھ دی ـــــ بابا خاموش بیٹھا سنا کیا ـــــ بیچ بیچ میں وہ بندو کو گلے لگاتا جاتا یا پیٹھ تھپکنے لگتا ـــــ

جب دل کی پوری بھڑاس نکل چکی تو بندو پُرسکون سا ہو کر بولا ـــــ
" بابا میں سمجھ رہا تھا کہ یہ سب سُن کر اور یہ جان کر کہ میں ایک نیچ ذات سے ہوں آپ مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے ـــــ "

بابا مسکرایا بڑی دانشمندانہ مسکراہٹ ـــــ

پھر بولا ـــ" بیٹا کوئی چھوٹا ہے نا بڑا ـــ انسان کا اوّل بھی مٹی ہے آخر بھی مٹی ـــ سب ایک طرح پیدا ہوئے ایک ہی طرح مریں گے ـــ اس میں بڑائی چھوٹائی کہاں سے آگئی ؟

بندو کی نظروں میں بابا آکاش سے بھی اونچا ہوگیا ـــ

اُس دن بندو بہت ہی خوش خوش باہر سے لوٹا اور آتے ہی بابا سے لپٹ کر بولا ـــ" بابا بس آپ کا آشیرواد چاہیئے۔ آج ایک ایسا آرڈر ملنے کی امید ہے کہ بس آر یا پار ـــ"

بابا مسکرایا ـــ" وہ تو اللہ کے فضل سے تجھے مل ہی جائے گا ـــ لیکن اب اس کے بعد سب سے پہلا کام تیری شادی ہوگی ـــ"

" شادی ـــ" بندو حیرت سے بولا ـــ" وہ کیوں بابا ـــ"

" ارے میاں شادی ہوگی تو گھر بار ہوگا، بال بچے ہوں گے ـــ یہی تو اصلی زندگی ہے ـــ"

اک دم بندو سنجیدہ ہوگیا ـــ" نہیں بابا اصلی زندگی یہ نہیں ہے۔ اصلی زندگی تو وہ ہوگی جب میں اپنی نیچ ذاتی کو اوپر اٹھا سکوں گا ـــ یہ میرا عہد ہے بابا ـــ میرے منصوبے اور مقاصد کچھ اور ہیں، آپ نہیں سمجھیں گے ـــ"

" میں سب سمجھتا ہوں بیٹا اور مجھے خوشی بھی ہوتی ہے تمھیں اور تمہارے حوصلوں کو دیکھ کر۔ اصل میں جب بھی دنیا میں جہالت اور ظلم کا گھور اندھیرا چھایا ہے، تم سا کوئی نہ کوئی جیالا مشعل لے کر اٹھ کھڑا ہوا ہے ـــ مہاتما گاندھی کی مثال ہمارے سامنے ہے ـــ"

" بابا آپ جیسی مہان ہستی مہاتما گاندھی کا نام لے بھی سکتی ہیں۔ میں تو اتنا حقیر

اور چھوٹا ہوں کہ اپنی زبان سے یہ نام ادا کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا —
ہاں آپ کے چرن چھو کر یہ عہد کر سکتا ہوں کہ باپو نے جو مشعل جلائی تھی اُسے
بجھنے نہیں دوں گا —"
بابا اسے محبّت سے دیکھے جا رہا تھا — "بابا میرے دل میں بدلہ لینے کی کوئی
تمنّا نہیں —" بدلہ تو کم ظرف لیا کرتے ہیں — میں ایک ہی بات چاہتا ہوں
کہ سچائی کا برابری اور اونچ نیچ کا جھگڑا ختم ہو جائے اس کے لئے بابا —
"میں نے ایک نعرہ ایجاد کیا ہے کہ غریبوں کو اتنا امیر کر دو کہ امیر ان کے سامنے
غریب نظر آنے لگیں —" بابا مسکرانے لگا — ہاں بابا میں نے دیکھا ہے
اور اپنے حسابوں سے ہی سمجھ سکا ہوں کہ دنیا میں سارے جھگڑے دراصل غریبی
کے پیدا کردہ ہیں — بابا آپ کو نہیں پتہ خاص طور سے چھوٹے دیہاتوں
میں ہم غریب اچھوت کی طرح دھتکارے جاتے ہیں — کیسے کیسے ہمارا
دل جلتا ہے۔ کیسی کیسی آہیں ہمارے دلوں سے نکلتی ہیں ....
" بیٹا جس طرح چھوٹا بچّہ بھوک سے تڑپے تو ماں کی چھاتیوں میں دودھ
آپ ہی آپ جوش مارنے لگتا ہے اسی طرح مظلوم کی آہ خداوند تعالیٰ کی محبت
کو جوش دلا دیتی ہے — تڑپ اور آہ میں اثر ہو — تو عرش عظیم کے
پائے ہل جاتے ہیں — مجھے خدا سے یقین ہے میاں کہ تمہاری کوششیں خدا
کے یہاں ضرور قبولیت کا درجہ پائیں گی — تم نے دیکھا ہوگا کہ چمڑے کی دھونکنی
لوہے تک کو پگھلا کر رکھ دیتی ہے —

ایک عالیشان بنگلے کا آج افتتاح تھا۔ جھلمل جھلمل قمقمے یہاں سے

وہاں تک جگمگا رہے تھے ۔۔۔ سامنے کی دیوار پر بڑی سی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی جس پر " دھرم راج اسٹیل اینڈ آئرن ڈیلر" کا خوبصورت نام جھم جھما رہا تھا ۔۔۔ مہمانوں کے بھیڑ بھڑکے میں کئی گاڑیوں کو پسِ پشت ڈالتی ایک لمبی سی گاڑی پھاٹک کے اندر داخل ہوئی ۔۔۔

"دھرم راج جی آگئے ۔۔۔"

"دھرم راج جی آگئے ۔۔۔"

لوگ آپس میں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے ۔۔۔

کھٹاک سے گاڑی کا دروازہ کھول کر بندو اترا ۔۔۔ ایک شاندار اور عظیم الشان شخصیت ۔۔۔" اس نے تیزی سے اُتر کر دوسری طرف کا دروازہ کھولا ۔۔۔

" آیئے بابا ۔۔۔ اس گھر کا افتتاح آپ کو کرنا ہے۔ آپ ہی کے شبھ قدم سب سے پہلے اس گھر کی دہلیز کو چھوئیں گے ۔۔۔"

ناں ۔۔۔ ناں کرتا بابا اترا ۔۔۔ اس کے پیچھے بندو اور لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ ۔۔۔ بابا نے ربن کاٹی اور دعا کی ۔۔۔" خداوندا اس گھر کو سدا بھرا پُرا رکھنا اور اس گھر کے مکینوں کو ہمیشہ نیکی اور بھلائی کے راستے پر چلانا ۔۔۔" باہر آتشبازی چھوٹنے لگی ۔ اور مستعد نوکر مٹھائیوں اور مشروبات کے تھال اِدھر سے اُدھر کرنے لگے ۔۔۔

نوخیز اور حسین لڑکیاں جان بوجھ کر دھرم راج کے سامنے آنے لگیں ۔۔۔

بابا کے جھونپڑے کے سامنے لمبی سی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اندر بندو بابا سے الجھ رہا تھا ۔۔۔

"بابا آپ نے کہا تھا کہ آتے جاتے رہا کریں گے۔ دیکھئے آپ اپنا وعدہ نہیں نبھا رہے ہیں ــــ"

"تو تو نبھا رہا ہے نا ــــ"!

"ہاں بابا وہ تو میں انشاء اللہ زندگی بھر نبھاتا رہوں گا ــــ جس طرح آپ پانچ وقت کی نماز یہ کہہ کر پڑھتے ہیں نا کہ یہ فرض ہے جو ٹالا نہیں جا سکتا، اسی طرح میرا روزانہ آپ کے ہاں آکر ایک بار آپ کے درشن کر لینا بھی فرض ٹھہرا۔ ــــ یہی میری عبادت ہے ــــ"

بابا ایک جوتے میں کیل ٹھونکتے ہوئے مسکرایا اور ہتھوڑی زمین پر رکھ کر بولا۔ "میری محبت تو اتنی کرتا ہے بات نہیں مانتا ــــ شادی کر لینے سے کیا تیرے کام کاج رک جائیں گے ــــ بلکہ دل جما رہے گا تو اور اچھی طرح کام ہوں گے ــــ"

بندو کچھ فکر مند سا نظر آتا تھا ــــ "نہیں بابا ابھی فی الحال تو اس پروگرام کو اٹھا ہی رکھئے ــــ مجھے ایک الگ سوچ کھائے جا رہی ہے ــــ"

"وہ کیا ــــ" بابا بھی فکر مند ہو گیا ــــ

"بندو زمین پر اطمینان سے بیٹھ گیا ــــ" بابا دراصل بات یہ ہے کہ مجھے ہر لمحہ یہ ڈر سا لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی میری اصلیت کو پہچان نہ لے ــــ آجکل تو طرح طرح کے بزنس والے ــــ اخبار والے ملنے آتے رہتے ہیں ــــ اکثر میری زندگی میرے ماضی میری جد و جہد اور اس کامیابی کی تفصیل جاننا چاہتے ہیں ــــ ابھی تو میں نے کچھ بھی نہیں کیا ہے بابا ــــ اگر ادھر بیچ میں لوگوں کو پتہ چل گیا کہ میں دراصل ایک نیچ ذات کا اچھوت ہوں تو آپ جانیں بابا عوام کی طاقت کا کوئی مقابلہ

نہیں کر سکتا ـــــ میں اکیلا پس جاؤں گا اتنی بڑی طاقت کا مقابلہ نہ کر پاؤں گا ....
بابا بھی کچھ پریشان سا ہو گیا ـــــ "اور بابا آپ جانتے ہیں دشمنوں اور بہکانے والوں کی اور بہک جانے والوں کی کسی بھی زمانے میں کمی نہیں رہی ہے ـــــ"
"میں اچھی طرح تمہارا مطلب نہیں سمجھا میاں ـــــ" بابا سر ہلا کر بولا ـــــ
"دیکھئے نا بابا یوں دروازہ بند رہے تو کوئی دستک نہیں دیتا لیکن ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے کوئی بھی سر اندر ڈال کر جھانک لیتا ہے ـــــ مجھے لگتا ہے اور غلط نہیں لگتا کہ میری زندگی میں کہیں نہ کہیں ایسا جھول ضرور ہے کہ لوگ انگلی اٹھا سکیں ـــــ اسی لئے میں تنہا رہنا چاہتا ہوں تاوقتیکہ میں کوئی ٹھوس کام نہ کر لوں۔ میں اپنے راز کا سوائے آپ کے زندگی میں کسی کو شریک نہیں بنا سکتا ـــــ" پھر وہ کچھ رک کر بولا۔
"کل میں ویسے گاؤں جا رہا ہوں ـــــ" بابا نے چونک کر اسے دیکھا۔
"ہاں بابا ـــــ چودہ برس بہت طویل مدت ہے ـــــ رام کی طرح میں نے بھی ایک پورا بن باس جھیلا ہے ـــــ میں چاہتا ہوں ذرا جا کر دیکھوں تو سہی کہ کیا وہاں کی پوتر دھرتی پر پڑنے والے ناپاک نقوش کو مٹانے کے لئے آج بھی کمر سے جھاڑو باندھی جاتی ہے؟ کیا ابھی تک بچیوں کے پیر ٹیڑھے ..... وہ اچانک چپ رہ گیا ـــــ
اس کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں دیکھ کر بابا کا اپنا جی بھی پگھل گیا ـــــ وہ ذرا سنبھل کر بولا ـــــ
"لیکن بابا میں اس سوٹ پینٹ ٹائی اور گاڑی میں نہیں جاؤں گا ـــــ میں ایک اچھوت کی طرح ہی جاؤں گا تاکہ اس مٹی سے اپنا رشتہ یاد کر سکوں ـــــ"

بڑا سا پگڑ جس سے آدھا چہرہ بھی ڈھک گیا تھا، دھوتی کرتا اور بکبڑ سی چپل ـــــ اپنے گاؤں کو جانے کے لئے بندو نے وہ راستہ چنا تھا جو ۴۔ ۶ کوس پہلے ہی سے ہریجن بستی سے نکلتا تھا ـــــ اس گاؤں کا نام چندالو تھا۔ جو اس کے اپنے سونا گاؤں سے بہت پہلے پڑتا تھا ـــــ

"سُنتے ہیں دیش میں بہت سدھار ہو رہے ہیں ذرا دوسری ہریجن بستیوں کو بھی دیکھتے چلیں ـــ" اس نے پگڑی سر پر جاتے ہوئے اپنے آپ کو سُنایا۔ تھوڑی دیر بس سے اتر کر وہ پیدل چلا گیا ـــ مزے مزے میں کھیتوں کی ہوا اور مناظر کے درشن کرتا ہوا ـــ پھر اس کا دل ٹوٹنے لگا ـــ وہی مخصوص چہرے ـــ وہی شیشوں کی نوک کی طرح دل میں چبھ جانے والی یادیں ـــ وہی کھیتوں میں کام کرتے ہوئے اچھوت ـــ گوبر تھاپتی، اُپلے سمیٹتی اُن کی عورتیں ـــ ننگ دھڑنگ بچّے ـــ زمین داروں کے کارندے۔ ہاتھ میں سونٹے اٹھائے عورتوں کو تکتے، بظاہر اُن کے کاموں کی نگرانی پر مامور مگر ان کے جسموں کو ٹٹولتے ہوئے ـــ کہیں کہیں روٹی کھاتے ہوئے ہریجن کسان ـــ جن کے خشک حلق سے سوکھی روٹی اور پیاز اترتی نہ تھی اور جو ہر نوالے کو پانی کے گھونٹ سے اندر ڈھکیل دیتے تھے ـــ

اے ہندوستان!
اے میرے جنت نشان ...... !

اس نے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی مطلق کوشش نہ کی ـــ ڈھم۔ ڈھم۔ ڈھم۔ کہیں دور ڈھول پٹ رہا تھا ـــ کسی کی حسب دستور نیلامی اٹھ رہی ہوگی۔ وہ تلخی سے دل ہی دل میں ہنسا ـــ چندیا ـــ چندیا بیوپاری کے

چاندی کے تار سے، کچھ فاقہ زدہ بچوں کے منہ سے چُرایا ہوا اناج کہ وقت پر
ان ہی کا دوزخ بھرا جا سکے ـــ اٹھاؤ بولی ـــ اٹھاؤ .....
سامنے نظر اٹھائی تو دھم دھم کی آوازوں کے ساتھ مجمع بھی بڑھتا جا رہا تھا
ـــ اس نے ادھر سے نگاہیں ہٹالیں اور اپنے دل کو سنایا ـــ
"کیوں پرانی باتیں یاد دلا رہے ہو بھائی ـــ آنکھوں کا ایک مصرف دیکھنا
بھی ہے صرف رونا ہی نہیں ـــ"
وہ ایک جھاڑ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ـــ اُسی کی ذات کا ایک آدمی
اس کے قریب سے گذرا ـــ
"مسافر ہو ـــ؟"
اس نے سر ہلا دیا ـــ
"کس گاؤں کے ـــ"؟
"سارے گاؤں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کہیں کا بھی سمجھ لو۔"
"کھانا کھاؤ گے ـــ؟ ایک روٹی ہے آدھی آدھی کر لیں گے۔"
"روٹی کے ٹکڑے مت کرو اس محبت سے میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے
ہو جائیں گے بھائی ـــ" اُس نے کہنا چاہا مگر آنسو گلے میں پھندہ بنے بیٹھے تھے۔
اُس نے بمشکل انکار میں سر ہلا دیا ـــ
"تو پھر پانی ہی پی لو ـــ تھکے ہارے لگتے ہو ـــ"
"ہم سب تھکے ہارے ہیں ـــ اپنی اپنی منزلوں سے بھٹکے ہوئے ـــ
کون جانے منزل ملے گی بھی یا نہیں ـــ"
اُس نے پانی کا لوٹا لے کر چند چھپکے منہ پر مارے۔ ایک دو گھونٹ پیے اور

آگے بڑھ گیا ــــ اس کے دل و دماغ اور روح میں ایک آگ سی بھر گئی تھی۔
"کون کہتا ہے دن بدل گئے ہیں ــــ؟ یہ دن کبھی نہیں بدلیں گے ــــ
کبھی نہیں، جب تک کہ ہم خود نہ آگ میں کود پڑیں .....

"ابے سُن" ــــ اچانک ایک آواز نے اسے چونکا دیا ــــ اس نے
مُڑ کر دیکھا ــــ اور دیکھتے ہی حیرت زدہ سا رہ گیا ــــ زمیندار تھا جیسا بڑا بیٹا!!
یہ گاؤں تو چندا پور تھا ــــ یہاں اس کا کیا کام؟ وہ تو سونا پور کا جاگیر
دار تھا! چھوٹے زمیندار نے اُسے نہیں پہچانا، لیکن وہ پہچان گیا تھا ــــ
سَن سَن کرتا خون اس کے چہرے پر چھلک آیا ــــ گھوڑے پر بیٹھا ہوا چھوٹا
زمیندار اُسے اس طرح کھڑا دیکھ کر غصّہ سے بولا ــــ
"سُنتا نہیں ــــ بہرا ہے کیا ــــ میں نے تجھے بلایا ہے"
بندو دھیرے دھیرے غصّہ کو ضبط کرتا آگے بڑھا، اور گھوڑے کے
قریب جا کر زمیندار کو دیکھتا ہوا کھڑا ہو گیا ــــ
"یہ چابک میرے ہاتھ سے گر گیا ہے ذرا اُٹھا کر دے تو ــــ"!
بندو ذرا ٹیڑھے لہجے میں بولا ــــ "گھوڑے پر چڑھنا آتا ہے تو اترنا بھی
آتا ہی ہوگا ــــ خود اتر کر کیوں نہیں اٹھا لیتے ــــ"
زمیندار نے عجیب سی نظروں سے دیکھا، جس میں غصّہ سے زیادہ حیرت
تھی! پھر ذرا دانت پیس کر بولا ــــ
"تو اچھوت نہیں ہے ــــ"؟
بندو تلخی سے مسکرا کر بولا ــــ "تو اچھوت ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا

ہر حکم مان لیا جائے ــــ ؟ میں تمہارا چابک کس خوشی میں اٹھا کر دوں؟"
زمیندار نے اِدھر اُدھر سر گھما کر دیکھا ــــ کوئی قریب میں نظر نہ آیا ــــ
وہ تلملا کر بولا ــــ

" حرامزادے زمین کے کیڑے ــــ تجھے پتہ ہے ہم کون ہیں" ــــ ؟

ہندو غصّہ دلانے کے انداز میں ہنس کر بولا ــــ

" سونا پور کے چھوٹے جاگیر دار ! جو اس وقت گھوڑے پر بیٹھے ہیں ــــ لیکن بڑی عجیب بات ہے کہ بلندی پر، گھوڑے پر سوار ہونے کے باوجود تم مجھ سے سر جھکا کر بات کر رہے ہو اور میں زمین پر ہو کر بھی سر اٹھا کر تمہاری بات کا جواب دے رہا ہوں ــــ" !

چھوٹے زمیندار نے غصّہ سے بھن بھنا کر دیکھا، واقعی گھوڑے پر بیٹھنے کے باوجود بات کرنے میں اُسے سر نیچا کرنا پڑتا تھا جبکہ وہ اچھوت نیچ ذات کا آدمی سر اٹھائے اس سے زبان لڑا رہا تھا ــــ زمیندار گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے اتنی زور سے تڑپا کہ گھوڑا پیر پٹخ پٹخ کر اپنی بے چینی کا اظہار کرنے لگا ــــ

" ابے کوئی ہے ــــ" وہ اوپر بیٹھے ہی بیٹھے زور سے چلّایا ــــ

" بچّے بہادر ہو تو دوسروں کو پکارنے کی تکلیف مت کرو ــــ ایک کو ایک بہت کافی ہوتا ہے ــــ ویسے بھی ہمیں کوئی پہلوانی تو کرنی ہے نہیں ــــ بس ذرا ہاتھ پاؤں کھولنے ہیں ــــ"

گھوڑے کی راس اُچھالتا، زمیندار نیچے اتر آیا، اب وہ صبر و ضبط کی منزلوں سے گذر چکا تھا... نیچے پڑا چابک اب بھی اس کی غیرت کو للکار رہا تھا۔

" اب بھی وقت ہے۔ چابک اٹھا کر دے دے ــــ"

"سُنو زمیندار معمولی سی بات ہے، چابک اٹھانے کے لئے جھکنا بھی پڑتا ہے!
اور میں زندگی میں کسی انسان کے آگے نہیں جھکوں گا۔" وہ بڑی بے خوفی سے
زمیندار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ بات کہہ رہا تھا۔!

تو کیا یہ حقیر سر مندر میں بھگوان کے آگے بھی جھکے گا ___؟ زمیندار تلخی سے ہنس کر
بولا۔ کیونکہ مندروں میں اچھوتوں کا داخلہ منع تھا ___ پھر اچانک ہی وہ تیزی
سے جھپٹ کر اسکی گردن پکڑ کر دباتے ہوئے بولا ___
"ارے اساٹھ یہ ذرا انگلی کی گردن تو ایک چٹکی کے بھی قابل نہیں ___"
لیکن زمیندار کا اندازہ غلط تھا ___ چوبیس سالوں سے جمع ہوتی ہوئی کڑواہٹ
اب ایک ایسا شکنجہ بن گئی تھی کہ بڑی سے بڑی چٹان کو بھی پیس کر رکھ دیتی ___
بندو نے ایک جھرجھری دے کر اس طرح اپنی گردن چھڑائی مانو زمیندار کے
ہاتھوں میں کوئی اچیڑا ہوا ہو جس کی چکناہٹ سے وہ پھسل پڑا ہو ___
اب زمیندار نے تلملا کر چابک اٹھایا کہ بندو پر دے مارے ___ بندو
نے اسے اور تاؤ دلایا ___
" ہاں یہ ہوئی شرافت کی بات ___ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کیا کرو بچّے،
اس طرح صحت اچھی رہتی ہے ___"
"صحت کے بچّے تیری کھال نہ ادھیڑ دی ہو تو یاد رکھنا ___"
اُٹھے ہوئے چابک کی سونٹی پکڑ کر بندو نے اتنی زور سے اپنی طرف
کھینچی کہ زمیندار بھی ساتھ ہی لڑھکتا چلا آیا ___ شہر میں بوجھ ڈھونے ہاتھ
گاڑی بھر بھر وزن کھینچنے اور محنت مشقت کرنے سے بندو کے ہاتھ پاؤں

ایسے مضبوط نکل آئے تھے کہ جو بھی دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا ——

زمیندار اپنی جاگیر اور نوکروں کے بل بوتے پر بڑا ضرور تھا مگر طاقت میں بندو کا مقابلہ کہاں کر پاتا —— اوپر سے بندو اُسے جلائے جا رہا تھا —— اُسے کُتّے کی طرح پچکارتا ہوا بولا ——

"پچ پچ —— اچھے بچے یوں مٹی میں لوٹ کر اپنے کپڑے خراب نہیں کیا کرتے —— جاؤ گھر جاؤ —— نہیں تو ماں مارے گی ——"

اس کے بعد گھونسوں، لاتوں اور مُکّوں کا وہ زوردار تبادلہ شروع ہوا کہ گرد و غبار میں دونوں اَٹ گئے —— دُور سے کسی نے یہ تماشا دیکھا اور اس کے چیخ پُکار کرنے پر ایک ایک کر کے کئی لوگ جمع ہو گئے اور قریب آ گئے ——

سب دَم سادھے دو شیروں کی لڑائی دیکھ رہے تھے، جن میں سے کوئی بھی ہار ماننے پر تیار نہ تھا۔ دیکھنے والوں میں اکثریت اچھوتوں اور غریبوں کی تھی جن کے چہرے زبان حال سے چیتھڑوں میں لپٹے اور غریبی کی تصویر بنے بندو کی جیت کی دعائیں کر رہے تھے —— زمیندار کا ایک گھونسہ بندو کے منہ پر پڑتا تو کئی لوگوں کے منہ سے اُف کے آہ کی آوازیں نکل جاتیں اور بندو کی لاتیں زمیندار پر پڑتیں تو گو خوف کے مارے وہ کچھ بول نہ سکتے، مگر چہرے کھل اٹھتے —— اور شاید اس دن قدرت کو یہی منظور تھا کہ وہ چہرے کھلے رہیں کہ ایک زوردار گھونسے سے زمیندار بے ہوش ہو کر خاک پر گر پڑا۔

بندو نے ہانپتے ہوئے آس پاس کے کھڑے لوگوں کو مخاطب کیا ——

"سالے کو گھوڑے پر ڈال دو —— گھوڑا وفادار جانور ہوتا ہے گھر پہنچا دے گا۔"

"مگر بھیّا —— کچھ لوگ آگے بڑھے —— تم نے غضب کر دیا —— اب تمہاری

کھیر نہیں۔ تمہیں پتہ نہیں وہ سونا گاؤں کا چھوٹا ٹھاکر ہے ــــ"
" تو یہاں کیا کرنے آیا تھا ــ" ؟ بندو نے غصّہ سے پوچھا ــــ
یہاں کی جنیات بھی خریدنا چاہتا ہے۔ ایک سودا پکا کرکے جارہا تھا"
اور بھی جمین لینے والا ہے.......
" حالانکہ انسان کو صرف چھ ہات کی زمین بہت کافی ہوتی ہے ــــ" بندو اپنی رَو میں کہے گیا ــــ
" بھائی تم اس گاؤں کے تو نہیں لگتے ــــ" اس کی بہادری سے مرعوب ہو کر ایک عورت بولی ــــ
" ہاں بہن ٹھیک سمجھیں تم ــــ میں اس گاؤں کا نہیں لگتا۔ پھر بھی یہ گاؤں میرا بہت کچھ لگتا ہے۔ یہی گاؤں نہیں ــــ ہر گاؤں سے میرا ناطہ ہے ــ میرا ہی نہیں ــ ہم سبھی کا ــــ اور میں وہی رشتہ دوبارہ زندہ کرنے آیا ہوں ــــ"
آس پاس کھڑے سب لوگ اسے اس عقیدت سے دیکھ رہے تھے مانو وہ کوئی دیوتا ہو ــــ
اتنے میں ایک عورت لوٹا بھر پانی اور ایک تھالی میں روکھا سوکھا کچھ کھانا لے آئی اور بڑے پیار سے بولی ــــ
" لو بھائی ــــ تھوڑا کھاکر جرا آرام کرلو ــــ آج تو تم نے جیسے کہانیوں کی بات سچ کر دکھائی جن میں کوراجکمار' راکھشش کو اپنی ایڑی سے مسل دیتا ہے ــــ
" مسلنے کا ٹیم تو اب آئیگا میری بہن ــــ" بندو آپ پر زور دے کر ہاتھ منہ دھوتے بولا ــــ
" کھائی برتن میں ایک حد تک ہی پانی سما سکتا ہے۔ بعد میں تو چھلکے گا ہی ــــ"

" دیکھو سب لوگ مارے خوشی کے کیسے ناچ رہے ہیں کہ آج تم نے جمیندار کی ٹھکائی کردی۔ ایک آدمی نے چند بچوں عورتوں اور مردوں کی طرف اشارہ کیا جو مارے خوشی کے واقعی ناچنے گانے لگے تھے ـــــ "

بندو کا دل ایک عجیب سی امید اور خوشی سے بھر سا گیا ـــــ

کئی لوگوں نے اس سے اصرار کیا کہ ہمارے گھر چلیں مگر وہ وہیں ایک پیڑ کے کنارے لیٹ گیا اور پتہ نہیں دل پر سے کیسا بوجھ سا ہٹ گیا تھا کہ اسے وہیں پڑے پڑے نیند لگ گئی ـــــ

پتہ نہیں کتنا وقت گذر گیا تھا ـــــ گھوڑوں کے ہنہنانے، بیل گاڑیوں کی کھچر کھچر، جانوروں کی گھنٹیوں سے اس کی آنکھ کھل گئی، مگر وہ غلط سمجھا، اسکی آنکھ دراصل نیلامی بولنے والے کی تیز آواز سے کھلی تھی جو چلّا چلّا کر لوگوں کو ترغیب دلا رہا تھا ـــــ

" دیکھو لوگو دیکھو ـــــ کیا بڑھیا مال ہے ـــــ ہاں ہاں ایک ایک کپڑا اتار کر دکھاؤں گا۔ تبھی دام لگانا۔ ہاں تو کس نے کہا تھا ایک سو ایک ـــــ ایک سو ایک۔ دیکھو اب ادھر بھگوان کی کاری گری کا کمال!

جھر سے اس نے لڑکی کا بلاؤز پھاڑا۔ دیکھو ذرا غور سے دیکھو کیسا چاندی سا بدن ہے ـــــ ایسے بدن کے تو ..... ہاں تو کس نے کہا تھا ایک سو پچاس ایک ـــــ ایک سو پچاس دو ـــــ دیکھو ادھر کسی دل والے نے دو سو کی بولی دے دی ہے ـــــ

ابھی ایک کپڑا اور باقی ہے، وہ بھی اتر جائے گا تو پھر دیکھنا کیا حال ہے۔ مچھلی کی طرح ہاتھ سے پھسل پھسل پڑتی ہے سالی ـــــ اب دیکھو اگر دیکھنے کی طاقت ہو۔

پھر دام لگانے میں کنجوسی مت کرنا بھائی لوگو ـــــ

بندو بیچ وتاب کھاتا آگے بڑھا ..... ذلیل ندیدی بھوکی نظریں جوان لڑکی کے جسم کو چھید ے ڈال رہی تھیں ـــ گھاگرے کے اوپر سے وہ آدھی برہنہ ہو چکی تھی ـــ اور نیلامی بولنے والا لوگوں کو اکسائے جا رہا تھا کہ وہ اُسے پوری برہنہ کر کے بتائے گا کہ بولی اونچی لگے ..... گھوڑے اپنے مالکوں کی بے تابی دیکھ کر ہنہنا رہے تھے ـــ گاڑی بان بلا ضرورت بیلوں پر ہاتھ پھیر رہے تھے ـــ ماحول میں بیک وقت شور بھی تھا اور سناٹے کا تناؤ بھی ـــــ

لڑکی دونوں ہاتھوں سے اپنا جسم چھپانے کی کوشش کرتی اور نیلامی پھر اسے لوگوں کے سامنے ڈھکیل دیتا کہ جی بھر کر دیکھ لیں ـــــ

" ہم اس چھوکریا کو کھریدیں گے ـــ" بندو بیچ وتاب کھاتا آگے بڑھا اور اپنے تلفظ کو جان بوجھ کر توڑ مروڑ کر بولا ـــ مگر پہلے کھوب اچھی طرح دیکھ کر ـ کہ مال کچا نہ نکلے ـــ"

نیلامی نے اور بیک وقت کئی لوگوں نے حیرت سے مڑ کر بندو کو دیکھا ـــ پھر جلدی سے نیلامی بولا ـــــ

" دیکھ لو ساہو ـــ" پر صورت سے لگتا تو نہیں کہ خرید سکو گے ـــ"

سارے موجود لوگوں نے زور کا ٹھٹھا مارا ـــــ

بندو نے گھور کر ـــ سب کو دیکھا ـــ اور دھیرے دھیرے لڑکی کی پیٹھ پر ہاتھ دھر کر اسے ایک طرف لے گیا جہاں ایک طرح دار گھوڑا کنوتیاں بدل رہا تھا ۔ مانو کسی خوب رو کو سواری کی پیشکش کر رہا ہو ـــــ

تیر کی سی تیزی سے اس نے لڑکی کو گھوڑے پر چڑھایا اور اُسی تیزی سے خود بھی چڑھا اور باگیں سنبھال کر بولا ـــــ

"اب جس کسی نے اپنی ماں کا اصلی دودھ پیا ہے وہ ہمارا پیچھا کرے ، گھاسلیٹ پینے والوں سے ہماری کوئی شرط نہیں ـــ"

اور اس تیزی سے اُس نے گھوڑا دوڑایا ہے کہ پہلے تو کوئی کچھ سمجھا ہی نہیں کہ کیا ہو گیا، پھر ہوش ٹھکانے آئے تو سب سے پہلے گھوڑے والا چلایا ـــ "ارے میرا گھوڑا ـــ" اور ساتھ ہی کئی اور دوسرے بھی جاگے اور کئی لوگوں نے پھرا پنے اپنے گھوڑے پیچھے ڈال دیئے ۔

اچانک بندو نے خود میں ایک ایسی بشاشت اور توانائی محسوس کی جو اتنی زندگی میں اس نے خود میں کبھی محسوس نہ کی تھی ـــ گھوڑوں کی پیچھے آتی ہوئی ٹاپوں کو سُن کر وہ بڑے ہلکے پھلکے اور پُر مزاح لہجے میں لڑکی سے بولا ـــ

"اب تم دیکھنا چھوکریا ہم ان بدماسوں کو کیسا چکمہ دیں گے ـــ"

اور واقعی اس نے ایک عجیب و غریب حرکت کی کہ پیچھے سے کئی گھوڑ سوار اس کے تعاقب میں انتہائی تیزی سے اس کے قریب آگئے تو اس نے اچانک اپنے گھوڑے کو روک لیا ـــ سارے گھوڑ سوار اپنی ہی رَو میں خوب دور تیز نکل چلے گئے اور بندو مخالف سمت میں تیزی سے دوڑ پڑا ـــ

یہ آنکھ مچولی بڑی دیر تک چلتی رہی اور آخر میں بندو نے گھوڑے کو اتنا تیز دوڑایا کہ پھر کسی تعاقب کی گنجائش نہ رہی اور وہ دھیرے دھیرے دلکی چال پر گھوڑے کو ڈال کر سکون سا محسوس کرنے لگا ـــ

اس وقت تک وہ پہر اتر چکی تھی ـــــ ماحول میں ایک خوشگوار خنکی رچنی شروع ہو گئی تھی ـــــ کھیتوں سے پیاری پیاری ہوائیں اپنے ساتھ مدھ ماتی خوشبوئیں لئے چلی آرہی تھیں ـــــ ایسے ماحول میں اچانک بند وبجد بشاش ہو اٹھا ـــــ اور اسے خود حیرت تھی کہ وہ جو زندگی بھر ہونٹوں کو سیمٹے رہا آج یوں ہنسنے پر خود کو مجبور کیوں پا رہا تھا ـــــ

"مجا آگیا نا ـــــ" وہ خواہ مخواہ مذاق کے موڈ میں آگیا تھا ـــــ

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا ـــــ بڑی دیر بعد وہ اپنے آپ کو حالات کی شدت میں ڈھال سکی ـــــ پھر بولی ـــــ

"آپ بہت اچھے ہیں ـــــ"

"ہاں ـــــ" وہ ہاں کو لمبا کر کے بولا ـــــ "اچھے تو ہم بہت سوں کو لگتے ہوں گے پر ہم کو بھی تو کوئی اچھا لگے ـــــ" اس پر لڑکی نے اچانک اسے پلٹ کر دیکھا اور وہ یکبارگی ششدر سا رہ گیا ـــــ

"کھوبصورت تو واکعی تم اتنی ہو کہ دو ہجار میں بھی بکتی تو کم تھا ـــــ"

لڑکی نے پھر سے پلٹ کر اسے دیکھا ـــــ اب کی بار اس کے چہرے پر ذرا غصہ تھا "مگر یہ جگیر کیا تھا نیلامی کا ـــــ" وہ اس کے کان میں جھک کر بولا ـــــ

لڑکی ذرا آزردہ ہو گئی بولی ـــــ "بے سہارا عورت راستے میں پڑا سکہ ہوتی ہے جسے کوئی بھی راہ چلتا جیب میں اٹھا کر ڈال لیتا ہے ـــــ"

بندو آنکھیں ٹپٹپا کر بولا ـــــ

"انگریجی تو بہت بڑھیا بول لیتی ہو ـــــ"

"انگریزی ـــــ ؟" وہ عجیب سے لہجے میں بولی ـــــ " جو اپنی ہی زبان سے بات کرنے

کو ترستا ہو وہ دوسروں کی زبان میں کیا بات کرے گا بھلا ــــ"

" اب تو تم اور بھی بڑھیا انگریجی بول گئی ہو ــــ واہ ــــ"

" پتہ نہیں کس مسخرے سے پالا پڑ گیا ہے ــــ لڑکی نے جھلا کر سوچا ــــ لیکن اس کا ذرا بھی سنجیدگی سے اس پر غصہ ہونے کو نہ چاہا ــــ اتنے ساروں کے مجمع سے یوں بہادری سے نکال لایا ــــ بیٹھتے ہی اپنا پگڑ حوالے کر دیا کہ اپنا جسم ڈھانک لو ــــ اب اتنی شرافت سے لئے جا رہا ہے ــــ کیا ہوا اگر مزاج میں ذرا دل لگی کرنے کی عادت ہے ــــ اچانک بندو نے پوچھا ــــ

" بھوک لگی ہے ــــ ؟ لگی تو ہو گی ــــ ہمیں بھی لگی ہے " پھر کھیتوں میں اِدھر اُدھر نظر ڈال کر بولا ــــ مگر ہم کچھ لائیں گے تو ہمارے ہاتھ کا کھا لو گی نا ــــ ؟"

لڑکی نے ذرا حیرت سے اسے دیکھ کر پوچھا ــــ" ؟ آپ ؟

" آپ کون ــــ ہیں ــــ" ؟ لڑکی کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا کہ وہ اپنے آپ سے بولا ــــ" میاں دھرم راج گئے کام سے ....."

پھر وہ بیحد لاپروائی سے آسمان کی طرف خوب اونچا ہاتھ کر کے بولا ــــ" ہم ہم تو بھیا بہت، بہوت اونچی جات کے باہمن ہیں ــــ" پھر ذرا غم سے ــــ" مگر جما گریب ہیں "

آپ ۔ آپ برہمن ہیں ــــ ؟ وہ اک دم چلتے گھوڑے پر سے کود پڑی ــــ آپ تو ہمارے مائی باپ ہیں ــــ آپکے برابر تو بیٹھنا بھی پاپ ہے ــــ"

" دیکھو چھوکریا ــــ وہ ہاتھ ہلا کر بولا ــــ ہم نہ تو عورت ہیں جو تمہاری مائی بن سکیں اور نہ تو ..... ہم تمہارے باپ بننا چاہتے ہیں کیونکہ ہمارے دل میں تمہاری اور سے گھور پاپ آ گیا ہے ــــ اور جب کسی کے دل میں کسی کی

طرف سے پاپ آجائے تو وہ پاپ کیسے بن سکتا ہے ــــ؟ کیوں کتیا ــ" ؟
لڑکی کے چہرے پر ایک حیا آمیز مسکراہٹ آگئی۔ اس نے سوچا کس قدر
عجیب بات ہے کہ ابھی چند لمحے پیشتر، میں ایسے ہی مول تول سے گذر رہی تھی۔
اور دیکھا جائے تو میں ابھی بھی ایک مرد ہی کے ہاتھوں میں ہوں ــــ مگر شاید
محفوظ ہاتھوں میں !!

لڑکی کو کھڑا دیکھ بندو ہنسا ــــ " تم تو گھوڑے پر سے اس طرح مستاکی مشاقی
سے کود پڑی ہو کہ لگتا ہے کہ ساری جندگی گھوڑوں پر سے کودتی رہی ہو "
اور ہاتھ بڑھا کر اُسے اوپر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا ــــ

" چلو جلدی سے بیٹھ جاؤ ــــ رات پڑے ہیں اپنے گھر پہنچنا ہے ــ"

لڑکی بعید سعادتمندی سے اس کے سامنے چڑھ بیٹھی ــــ

" تمہارا نام تو ہم نے پوچھا ہی نہیں چھوکریا ــــ"

" دیوالی "ــ وہ دھیرے سے بولی ــــ

بندو چونک سا گیا ــــ " ارے واہ ــــ دیوالی ! ــــ پھر تمہارے ہاں
چراگ اور تیل کا تو کوئی کھرچہ ہی نہیں ہوگا نا ــــ دن رات کے اجالے ــ"

" نہیں بابو صاحب ہم لوگ تو اجالوں کے بیچ رہ کر بھی اجالوں کو ترسنے والے
لوگ ہیں ــ جس طرح میری ماں ہولی ہو کر بھی زندگی بھر رنگوں کے لئے ترستی رہی ــــ"

بندو نے اچانک سوچا یہ بھی محرومیت سے فرار پانے کا ایک راستہ ہے۔
خوشبوؤں سے محروم لوگ، اجالوں سے محروم لوگ، رنگوں سے محروم لوگ اگر
اپنے نام دیوالی ہولی رکھ بھی لیں تو کیا انھیں اجالے اور رنگ مل جاتے ہیں ــــ؟

وہ بولا کچھ نہیں سنے گیا ــــ

" ماں کو رنگین کپڑے پہننے کا اتنا شوق تھا، لیکن وہی بتاتی تھی کہ جب بابا کو بیگار میں گھسیٹا گیا تو وہ بیمار تھے، بہانہ سمجھ کر زمیندار نے اتنا پٹوایا کہ دم نکل گیا ـــ پولیس کیس بھی نہ بن سکا۔ پیسے میں بڑی طاقت ہے نا؟ پھر ماں نے کبھی رنگین ساڑی نہیں پہنی ـــ ساون میں جب سب سکھی سہیلیاں ہری رنگ کی چُنریاں پہنتی تھیں تو ماں اپنی سفید کفنی ایسی ساڑی پہنے برہا کا ایسا درد بھرا گیت گاتی تھی کہ ساجن اگر تم پردیس سے سونا لینے جاتے اور واپسی میں دیر ہو جاتی تو پہلے ہی میرے کاجل ایسے بال چاندی جیسے ہو جاتے، مجھے غم نہ ہوتا، لیکن تم تو ایسے پردیس گئے ہو جہاں سے کوئی واپس ہی نہیں آتا ـــ"

ماحول اچانک سناٹے میں ڈوب گیا تھا۔ بمشکل بندو پوچھ سکا۔

" اور ماں ـــ؟

" وہ ہو لی تھی نا ـــ؟ اس نے اپنے سونے جیسے بدن کی خود ہی ہولی جلا ڈالی ـــ زمیندار نے اسے ایک دن گڑ کی راب بنانے اپنی حویلی پہ بلایا تھا ـــ راب کے ساتھ ساتھ اُسے میری ماں بھی بہت مزے کی لگی تھی ـــ

تم بھی ـــ میں بھی ـــ ہم سب ہی، ایک منزل کے راہی ہیں.... خوش مذاقی کا وہ غلاف بندو پر سے سرک گیا تھا وہ غم کے ساتھ کہہ رہا تھا ـــ ہم سب کی ایک ہی کہانی ہے ـــ"

" ہم سب کی ـــ؟ ـــ آپ کی بھی ـــ" دیوالی نے حیرت سے پلٹ کر اسے دیکھا، مگر وہ کہیں ماضی میں کھو چکا تھا ـــ

گھوڑے کی پھڑ پھڑ سن کر بابا بغل میں جانماز دبائے دروازے سے نکل آیا۔
اور بندو کو دیکھ کر بے حد حیرت سے بولا ــــ
"میاں ــــ تم ــــ" ؟
"ہاں بابا میں" ــــ بابا حیرت سے دیوالی کو دیکھے جا رہا تھا ــــ بندو نے
ذرا آنکھیں چرا کر ذرا اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے تعارف کروایا ــــ
"بابا یہ ایک بے سہارا لڑکی ہے ــــ راستے ہی میں ......
بابا نے مسکرا کر بات اچک لی ــــ " تو یوں کہو کہ راستے ہی میں منزل مل گئی "۔
بندو شرما کر آئیں بائیں شائیں کرنے لگا ــــ
" نہیں بابا وہ کچھ بات ایسی ہوگئی کہ ...... وہ ہاتھ ملتے ہوئے ذرا پشیمانی سے
کہنے لگا" ــــ بابا میں آپ کو بعد میں ساری بات بتاؤں گا ــــ اور دیوالی کی آنکھ
بچا کر اس نے بابا کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے ــــ
بابا نے ہنس کر دیوالی کو گلے سے لگا لیا ــــ بیٹی بڑے نصیب والی تھی جو
اچھے ہاتھوں میں پڑ گئی ...... دیوالی نے گھبرا کر پہلے بندو پھر بابا کو دیکھا ــــ
بابا نے بڑی جلدی سے بات سنبھال لی ــــ میرا مطلب تھا ہمارے یہاں
کوئی تکلیف نہیں ہوگی بیٹی تمہیں ــــ مجھے اپنے باپ کی جگہ سمجھنا اور ......
بندو جلدی سے اس کے کان میں جھک کر بولا ــــ " مگر خدا کے لئے مجھے
بھائی نہ سمجھ لینا ــــ "
بابا کھانے پینے کا انتظام کرنے اندر گیا تو بندو بڑی پریشانی سے
بولا ــــ " یہ سالا گھوڑا تو میری جان کو ہی چپک گیا ــــ "
دیوالی مسکرا کر بولی ــــ " ارے واقعی آپ نے اسے کھلا چھوڑ دیا پھر بھی جا نہیں رہا۔"

بندو ہنس کر بولا ـــــ "ہم رسّی تو کھلی چھوڑ دیتے ہیں مگر محبت سے باندھ لیتے ہیں۔" دیوانی شرما کر دروازے میں چلی گئی ـــ گھوڑے کی پیٹھ تھپ تھپا کر بولی ـــ اب تو وہیں چلا جا جہاں سے ہمیں لایا تھا ـــ میں اپنے گھر پہنچ گئی ہوں۔"

کھانے دانے سے فارغ ہو کر بندو نے کیلے میں بابا سے پوچھا ـــــ

"بابا میں دیوانی کو کہاں رکھوں ـــ"؟

بابا نے ذرا اسے حیرت سے دیکھا ـــ "اپنے پاس اور کہاں ـــ"؟

"لیکن بابا ـــ وہ پریشانی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا ـــ" آپ بات کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کیجئے ـــ میرے سینے پر آنے والے خطرے کی دو دھاری تلوار لٹک رہی ہے۔ میں جو لوگوں کی نگاہوں میں دھرماتما بن کر راج کر رہا ہوں، اگر انھیں پتہ چل جائے کہ میں نے گھر میں ایک ہر جن لڑکی رکھی ہوئی ہے تو سماج کے یہ ٹھیکے دار مجھے جینے دیں گے ـــ؟ شکوک اور مخالفتوں کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوگا اور میرا سارا مشن ٹھپ ہو کر رہ جائے گا ـــ"

"تو میں رکھ لوں گا ـــ"؟ بابا نے مشورہ دیا ـــــ

بندو نے جھونپڑے پر ایک نظر ڈال کر دھیرے سے کہا ـــــ

"بابا میں چاہتا تھا کہ ایک خزاں رسیدہ پودا جسے پالا مار گیا ہے، ذرا بہار بھی دیکھ لے"

بابا اس کے منہ اٹھائے پریشانی سے اسے دیکھتا رہا ـــ وہ کہے گیا ـــ

"بابا کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ دونوں ہی میرے ساتھ چل کر رہیں ـــ دیکھنے والے سوچیں گے کہ آپ باپ بیٹی ہیں۔ میرے مہمان ہیں ـــ" اور بڑی آس سے

اُس نے بابا کو دیکھا ـــ بابا نے ہاتھ ملتے ہوئے بیچارگی سے دیکھا ـــ
" میں نے کبھی سکینہ کو اکیلا نہیں چھوڑا بیٹا ..... اور وہ خاموش رہ گیا ـــ
گھٹنوں کے بل جھک کر اس نے بابا کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے ـــ
" بابا روحوں کا اگر کوئی وجود ہے اور وہ دیکھ سکتی ہیں، محسوس کر سکتی ہیں تو ماں جی کبھی بُرا نہیں مانیں گی ـــ آپ نے مجھے بیٹا بنا دیا ہے نا ـــ ؟ میں ماں جی کا بھی بیٹا ہوا نا ـــ ؟ کیا اولاد کا اتنا بھی حق نہیں ہوتا ..... "
بابا اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے بولا ـــ ٹھیک ہے ٹھیک ہے بیٹا ـــ اُس نے بندو کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ـــ
" لیکن حالات سنبھل جائیں گے اور تم دونوں کی شادی ہو جائے گی تو پھر میں یہیں چلا آؤں گا ـــ " وہ آنسو پونچھنے کو رکا ـــ " برسوں کا بندھن بڑی مشکل سے ٹوٹتا ہے بیٹا ـــ بڑی مشکل سے ..... "

دوسرے دن بندو سوٹ بوٹ میں ملبوس نئی سی گاڑی میں سوار ہو کر آیا تو دیوالی اُسے دیکھتی ہی رہ گئی ـــ آج وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق معلوم ہو رہا تھا۔ باوردی ڈرائیور نے مؤدب ہو کر کار کا دروازہ کھولا اور وہ یوں اترا جیسے بادشاہ اترتے ہیں ـــ پھر وہ جھونپڑے کے اندر آیا ـــ بابا اور دیوالی کو گاڑی میں بٹھایا اور ایک بہت ہی شاندار شاپنگ سینٹر میں گاڑی رکوا دی۔
دیوالی کے لئے ڈھیر سارے کپڑے اور عورتوں کے ساج سنگار والا خوب سامان خرید کر جب وہ پھر گاڑی میں آ بیٹھا ـــ تب بھی دیوالی محو حیرت سی اُسے

دیکھتی رہی ـــ پھر جب گاڑی ایک عظیم الشان بنگلے پر جاکر رکی اور نوکر لوگ دوڑتے ہوئے آئے تب بھی وہ یونہی بھونچکی رہی ـــ پھر جب اُن کے داخل ہوتے ہی ایک مستعد بیرا سفید وردی میں ٹھنڈے مشروب طشت میں سجائے داخل ہوا تو وہ جو سانس روکے تنی سی بیٹھی تھی، ذرا پُرسکون ہوئی اب وہ سمجھ گئی کہ یہ سفید لباس والا ہی اس گھر کا مالک ہے ـــ "شاید ہم لوگ دعوت میں آئے ہیں ـــ" اس نے اپنے آپ کو سنایا ـــ

مگر بندو نے ایک کمرے تک دیوانی کو لے جاکر بتایا کہ اب سے اس کمرے میں تم رہو گی ـــ" تو وہ پھر ڈر سی گئی ـــ بندو کا مرصّع لب و لہجہ اور مہذّب اندازِ گفتگو وہ اپنے حواسوں پر شک کرنے لگی ـــ

اور سُنو وہ محبت سے بولا ـــ" یہ سارے کپڑے تمہارے ہیں انہیں اس الماری میں سجا لو ـــ اور ساتھ ہی باتھ روم ہے، جاکر نہا لو ـــ" پھر اس نے مڑ کر ایک نوکر کو مخاطب کیا ـــ

"میم صاحب کے لئے گرم گرم کافی اور ٹوسٹ لے آؤ ـــ"

تو پھر خود کو پاگل لگنے لگی ـــ اب جو غور سے اس نے اپنے کمرے پر نظر ڈالی تو چکرا سی گئی ـــ عظیم الشان خواب دیکھنے کے لئے بھی پہلے حقیقت کی دنیا کا وجود ضروری ہوتا ہے ـــ کوئی انسان اپنے سامنے اعلیٰ اور ناممکن چیزیں دیکھے تبھی وہ اپنے تصوّر میں انھیں سوچ سکتا ہے اور خواب میں پا سکتا ہے۔ یہاں تو زندگی میں ایسی کوئی رنگین گھڑی آئی ہی نہیں تھی ـــ پھر یہ سب کیا تھا ـــ ؟ ہاں گاؤں کی ایک بڑھیا دادی سبھوں کو کبھی کبھار ایک پری محل کی داستان ضرور سُناتی تھی ـــ تو ـــ تو کیا یہ وہی پری محل تھا اور وہ اسی

پری؟؟ اس نے زور سے سر کو جھٹکا ــــ کہیں خواب تو نہیں ؟ ؟
نہیں ــــ خواب نہیں تھا ــــ سامنے ہی ایک کالی کالی سی شے کو کان اور منہ سے لگائے وہ برہمن اس پر لاکھوں کی باتیں کر رہا تھا۔ اُسے ہنسی آگئی ــــ "یہ پاگل ہے۔ آس پاس کوئی بھی نہیں اور اکیلے میں بک بک کئے جا رہا ہے ــــ"
"ہاں ہاں ــــ دو لاکھ ہی کی تو بات ہے نا ــــ ارے تو اس میں پوچھنے کا کیا سوال ہے، بھئی مال اٹھا لو فوراً ــــ ایسے موقعے قسمت ہی سے ہاتھ لگتے ہیں ــــ"
"تو کماری دیوی جی ــــ ایسے موقعے قسمت سے ہی ہاتھ لگتے ہیں ــــ شاید کبھی پچھلی زندگی میں تم نے کوئی پن کیا ہو اور بھگوان نے اس کا یہ صلہ دیا ہو ــــ" !!
کھانے کی لمبی چوڑی ٹیبل پر بھی دیوالی منہ پھُلائے بیٹھی رہی ــــ بابا تو ٹیبل کری پر یونہی آٹے پٹا سا محسوس کر رہا تھا ــــ دیوالی بھی بڑی سخت مشکل میں پھنسی ہوئی تھی۔ بابا کھا کر چلا گیا تو دھرم راج نے شرارت سے اُسے چھیڑا ــــ
"کھا لیئے میم صاحب ــــ نزاکت کیلئے ساری عمر پڑی ہے ــــ
دیوالی منہ چڑھا کر بولی ــــ ہم بہت ــــ بہوت اونچی جات کے باہمن ہیں ــــ پر جرا گریب ہیں ــــ"
پھر وہ کھڑی ہو کر غصہ سے بولی ــــ "آپ کو جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی ــــ آخر یہ سب ڈھونگ رچانے کا کیا مطلب تھا ــــ" ؟
"مطلب وطلب کچھ نہیں کماری جی ــــ بات بس اتنی سی ہے کہ میں چاہتا تھا کہ آپ مجھ سے بالکل بے تکلفی محسوس کریں ــــ" پھر وہ شرارت سے بولا ــــ "ویسے آپ آزاد ہیں جہاں چاہیں جا سکتی ہیں ــــ" "مگر بس اتنی بات تھی کہ سوچا تھا آپ ساتھ رہیں گی تو ذرا ایک ساتھ بیٹھ کر چائے وائے پی لیا

کریں گے ـــــ

دیوالی نے اُسے غصّہ سے گھور کر دیکھا تو وہ جلدی سے بولا ـــــ

"م ـــ میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ ہمیشہ چائے ہی پیا کریں۔ آپ چاہیں تو شوق سے کافی بھی پی سکتی ہیں۔ یہ تو اپنی اپنی پسند کا سوال ہے ـــ"

دیوالی منہ پھیر کر مسکرا دی ـــــ

رات کو دیوالی سو گئی تو بندو بابا کے کمرے میں آیا ـــــ

"بابا زندگی میں پروگرام تو بہت سارے بنا رکھے ہیں، اب شروعات کرنی ہے۔ میں اپنے گاؤں سے ابتدا کرنا چاہتا ہوں ـــ"

"تو بسم اللہ کرو میاں، نیک کاموں میں سوچ بچار کیسا ـــ" ؟

"بابا آپ میرے لئے دعا کیجئے ـــ وہ ان کے پیروں میں جھکنے لگا ـــ بابا نے پکڑ کر اٹھا لیا ـــ

"بیٹا سر صرف خدا کے حضور میں جھکتے بھلے لگتے ہیں۔ ہم حقیر بندے، کیوں ہمیں گنہگار کرتے ہو ـــ اور رہی دعا کی بات تو میری ہر آتی جاتی سانس تمہارے حق میں دُعا گو ہے ـــ"

لمبی سی گاڑی ایک نرم ہچکولے کے ساتھ رک گئی اور بنا ڈھم ڈھم کے ہی ایک جم غفیر اس کے آس پاس جمع ہو گیا، مانو کوئی نیلام ہونے جا رہا ہو۔ بچّے، عورتیں، متجسس مرد، ادھ ننگے، بھوکے فاقوں سے ادھ موئے ـــ

جن کے جسموں پر میل کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں ـــ جن کے چہرے زبانِ حال سے کہہ رہے تھے ـــ

"ہم بھوکے ہیں ـــ" ہم بھوکے ہیں ـــ"

ڈرائیور نے ایک نسبتاً معقول آدمی سے پوچھا ـــ

یہاں کوئی زمین بکاؤ ہے ـــ"

آدمی م۔م۔مم کر کے ہکلا کر رہ گیا ـــ مارے رعب کے اس کی زبان ہی رک گیا۔

اب دھرم راج نے گاڑی سے اُتر کر ذرا اپنائیت سے پوچھا ـــ

"ارے بھائی ـــ یہاں کوئی زمین۔کھیت۔خالی جگہ بکنے کے لئے ہے ـــ"

"ہے صاحب ـــ ایک دوسرا آدمی بولا ـــ پھر ہاتھ کے اشارے سے بولا۔ بہت ہے صاحب ـــ م۔مم مگر......

"مگر کیا ـــ؟ دھرم راج نے نرمی سے پوچھا ـــ

"جمیں دار صاحب کی ہے سب جگہ ـــ"

"ٹھیک ہے ہم بات کرلیں گے ـــ وہ اس وقت مل سکیں گے ـــ"

"کیوں نہیں صاحب۔ وہ سدا حویلی میں ہی تو رہتے ہیں ـــ مگر چھوٹے سرکار ملیں گے ـــ لین دین اب وہی کرتے ہیں ـــ"

"تو آؤ ہمارے ساتھ چل کر حویلی کا راستہ دکھاؤ ـــ"

اس نے گاڑی میں بیٹھ کر اس کے لئے جگہ بناتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ اسکا دس بارہ سال کا بچہ بھی تھا ـــ اس نے ہچکچا کر بچے کو دیکھا ـــ پھر گاڑی کو۔

دھرم راج مسکرا دیا ـــ "کوئی بات نہیں ـــ بچے کو بھی ساتھ بٹھا لو ـــ"

گاڑی چل پڑی ـــ پیچھے بہت سارے بچے بھاگ رہے تھے۔ دھرم راج نے انگور کا

ایک بڑا سا خوشہ اٹھا کر بچّے سے پوچھا — بڑی نرمی سے مُسکرا کر......
"یہ تمہیں کیسے لگتے ہیں —"
"بہت سندر —" بچّہ غور سے انگور دیکھتے ہوئے بولا۔
"سندر" — دھرم راج حیرت سے بولا — "ارے بھائی میں ان کی سندرتا کی بات نہیں کر رہا، میں پوچھ رہا ہوں ان کا مزہ تمہیں اچھا لگتا ہے۔
بچّے نے بے بسی سے باپ کو دیکھا — باپ نے سر جھکا کر جواب دیا —
"صاحب بارہ برس کا یہ ہو گیا — آج جندگی میں پہلی بار انگور دیکھ رہا ہے۔ اور یہ سنگترے اور چیکو اور انناس اگر آپ گاؤں کے کسی بچّے کو بتائیں تو کوئی یہ نہیں سمجھے گا کہ یہ کھانے کی چیج ہیں — وہ......
"نہیں — نہیں...... دھرم راج زور سے چلّایا اور اس نے اپنی بانہہ میں اپنا منہ چھپا لیا —
حویلی آ گئی تھی —" اس نے اپنا چہرہ اوپر کیا تو اس کا منہ آنسوؤں سے تربتر ہو رہا تھا۔ "ان پھولوں کو کھلنے دو — ان پھولوں کو کھلنے دو" اس نے تڑپ کر اپنے آپ کو سنایا —

دو ایسے انسان آمنے سامنے کھڑے تھے جنھیں ایک ہی ماں نے جنم دیا تھا — لیکن دو الگ الگ ماؤں نے انھیں اپنا دودھ پلایا تھا — اور یہ دودھ کی پکار تھی کہ ایک غریب کو اوپر لانے کی بات کر رہا تھا اور دوسرا انھیں پیچھا نگنی۔

"دھرم راج بھئی — آپکے وچار ویسے بہت اوچّے ہیں — اسکول اور

ہاسپٹل کھولنے کی اسکیم بھی بہت اچھی ہے لیکن آپ جانیں یہ نیچ لوگ لاکھ آپ سر پٹکیں، سدھرنے والے نہیں ـــ آپ نے وہ کہاوت نہیں سُنی کہ کتّے کی دم بارس نلی میں رکھو مگر رہے گی پھر بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی ـــ"

آس پاس بیٹھے ہوئے چھوٹے سرکار کے گرگوں نے زوردار قہقہہ لگایا ـــ دھرم راج سنجیدگی سے بولے ـــ

"اگر دُم کاٹ ہی دی جائے تو ـــ"

سب کے ہلتے ہوئے منہ لٹک گئے ـــ پھر وہ اسی رو میں کہے گئے ـــ سوال صرف زمین کے بیچنے اور خریدنے کا ہے، میں آپ سے سماج سدھار کے اپدیش لینے نہیں آیا ـــ آپ قیمت بتایئے ـــ"

"جس ٹکڑے پر آپ زمین لے کر ہاسپٹل بنانا چاہ رہے ہیں وہ تو بہت ہی ہوادار ہے، کھلے مقام پر ہے، گورنمنٹ بھی ایک بار کوشش کر چکی، مگر ہم نے طرح دے کر ٹال دیا ـــ آپ اگر چاہتے ہیں تو تین لاکھ میں ہو سکتا ہے۔"

انھوں نے ایک لاکھ سے بھی کم قیمت زمین کو خوب اونچا کر کے بتایا ـــ اور دوسری اسکول والی زمین دو لاکھ میں ..... اور وہ دھرم راج کے چہرے پر ردِّ عمل دیکھنے کے لئے ذرا رک گئے، جو کھڑے ہو چکے تھے۔

"ٹھیک ہے میرا سکریٹری کل ضروری کاغذات لے کر آجائیگا ـــ باقی معاملات آپ اور ہم شہر میں طے کر لیں گے ـــ"

چھوٹے سرکار اور ان کے گرگے دیکھتے ہی رہ گئے اور دھرم راج اپنے تُلے پُر اعتماد قدموں سے چلتے اپنی گاڑی میں جا کر بیٹھ بھی گئے ـــ

لوگوں کا جم غفیر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا ـــ انہوں نے گاڑی سے سر نکال کر کہا۔

اِس گاؤں میں آپ لوگوں کی صحت اور بچّوں کی مناسب تعلیم کے لئے، ہم ایک ہاسپٹل اور ایک اسکول کھولیں گے ـــ علاج بھی مفت ہوگا ـــ تعلیم بھی ـــ کتابیں، کاپیاں، پنسلیں، ضرورت کی ہر چیز اسکول سے ہی مفت ملے گی ـــ" اچانک اس نے سوچا کہ اگر ان سبھوں کو پتہ چل جائے کہ میری اصلیت کیا ہے ـــ تو ـــ ؟؟

(دوسری) بار دھرم راج سونا گاؤں آئے تو زمین دار کی ایک اور بڑی خالی حویلی کا سودا کر گئے وہ چاہتے تھے گاؤں میں بھی ایک مکان رہے تاکہ وقتاً فوقتاً اس میں آکر رہیں اور زیر تعمیر بلڈنگوں کا خود بھی جائزہ لیتے رہیں ـــ

تیسری بار جب اپنی لمبی سی گاڑی میں دھرم راج گاؤں آئے تو بات چیت بجائے چھوٹے سرکار کے بڑے سرکار نے کی ـــ قہقہہ لگا کر بولے ـــ

"بڑا بھاری دل دیا ہے بھگوان نے آپ کو ـــ ہم نے لوگوں کو جمع کرتے ہی دیکھا ہے خرچ کرتے نہیں ـــ"

دھرم راج اس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اُسے دیکھتے رہے جس نے ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی ماں کا قتل کر دیا تھا ـــ ہاں وہ قتل ہی تو تھا ـــ ہاں وہ لمحہ ـــ زندگی کا وہی لمحہ ایسا فیصلہ کن لمحہ تھا جس نے انھیں ہندوستان بھر کی غریب ماؤں کے لئے ـــ مجبور جوانیوں کے لئے، بھوکے پیٹوں کے لئے ایک مشعل روشن کر دینے کا عظیم الشان حوصلہ عطا کر دیا تھا ـــ آج وہی شخص ان کے سامنے کھڑا تھا اور یہ اُن کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ وہ اس کے سامنے مسکرا رہے تھے ـــ

• رائے صاحب ــــ وہ مسکرائے ــــ انسان دنیا میں خالی ہاتھ آتا ہے، جاتا بھی خالی ہاتھ ہی ہے ــــ پھر اگر ہم اپنے ہی جیسے چند انسانوں کے آرام اور خوشیوں کا سامان کر سکتے ہیں تو یہ جوڑ جمع کس لئے ــــ" ؟

"پھر بھی ان سکوں کے پیچھے ساری دنیا دیوانی ہے ــــ" ؟ رائے صاحب ہنسے

"دیکھئے رائے صاحب آسان سی بات ہے ــــ دھرم راج نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کیا ــــ" وہاں یہ سکّے کام نہیں آتے جو ہم یہاں جوڑ کر رکھتے ہیں ــــ اور جو سکّہ وہاں چلتا ہے وہ ہم جیسے گنہگاروں کے پاس وہاں نہیں ہوگا ــــ تو پھر اِن سکّوں کا حساب یہیں کیوں نہ صاف کر کے بھگوان کے سامنے جائیں...

رائے صاحب اس حساب سے بھنّا کر بولے ــــ" آپ بھگوان میں بہت وشواس رکھتے ہیں!! بہت بڑی بات ہے جناب۔ ورنہ آجکل کی نئی پود بھگوان تو کیا ماں باپ کو بھی نہیں مانتی ــــ"

" بھگوان کی بھگتی مندر میں چند پھول ہار اور ناریل چڑھانے سے نہیں ہوتی رائے صاحب ــــ انسانیت کی سیوا اور خدمت سب سے بڑی بھگتی، سب سے بڑی عبادت ہے ــــ اور میں اسی سیوا میں وشواش رکھتا ہوں ــــ"

رائے صاحب ذرا بور ہو کر بولے ــــ آج آپ کی آمد کا مقصد کیا تھا ــــ" ؟

" مجھے اس بار بزنس میں اُمید کے خلاف کچھ زیادہ ہی منافع ہو گیا ــــ چونکہ مجھے اس کی کوئی آس نہیں تھی اس لئے ضرورت بھی نہیں ہے، اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ گاؤں کے جو ہریجن بہت زیادہ غریب ہیں ــــ سب سے زیادہ غریب ہیں، اُن کو کم سے کم ایک ایک ایکڑ زمین خرید کر تحفہ دیدوں کہ خود ہی کاشت کریں کھائیں ــــ نہ کوئی مالک نہ نوکر ــــ"

رائے صاحب نے پینترا بدلا ــــ ذرا گرم ہو کر بولے ــــ "اس طرح تو ہمارے کھیتوں اور زمینات کے لئے مزدور نہیں مل سکیں گے ــــ"

"تو ہمارے اپنے یہ دو ہاتھ دو پیر کس لئے ہیں، اگر بھگوان ہر کسی کو دوسرے کا محتاج کر کے بھیجنے والا ہوتا تو ہر ایک کے ساتھ اسپیئر پارٹس کی طرح چند ہاتھ، چند پاؤں، چند سر بھی روانہ کرتا ــــ لیکن ظاہر ہے کہ بھگوان بڑا عقل مند آدمی ہے۔ اُس نے ہر انسان کو دو ہی ہاتھ دیئے ہیں اور دو ہی پاؤں ــــ پھر ذرا رک کر ..... تو آپ زمین بیچ رہے ہیں ــــ"

چھوٹے سرکار نے جتا دیا تھا کہ دھرم راج بڑا خرچیلا، پاگل اور سر پھرا سا جوان ہے۔ ایک ایک لاکھ کے دس دس لاکھ روپے دینے سے بھی نہیں چوکتا۔ لین دین کی بات میں ہی کروں گا، اس لئے وہ تلملا کر رہ گئے ــــ ویسے دل میں تو یہ آ رہا تھا کہ اسے اٹھا کر چٹے سے پکڑ کر پھینک دیں ــــ

"دیوالی ــــ چلو آج تمہیں سونا گاؤں گھما لائیں ــــ"

"دیوالی مسکرا کر بولی ــــ" میں آپ کے ساتھ بیٹھی کیسی لگوں گی ــــ"؟

"گاڑی جگمگانے لگے گی ــــ"

دیوالی شرما گئی ــــ "آپ تو مذاق بنا رہے ہیں میرا ــــ میرا مطلب تو کچھ اور تھا۔ وہ اداس سی ہو گئی ــــ آپ اتنے بڑے مہان آدمی ــــ پھر برہمن میں نیچ ذات کی لڑکی .....

"تمہیں پتہ ہے بھگوان رام نے اچھوت شوری کے جھوٹے بیر کھائے تھے۔

لوگوں نے بہت غصہ بھی کیا تھا لیکن بھگوان رام نے جواب دیا تھا، جو چیز من کی لگن اور شردّھا سے کھلائی جائے وہ پوتر ہوتی ہے..... پھر وہ عجیب شرارت بھرے لہجے میں بولا ــــ

"ہمیں ایک آدھ دن اپنے جھوٹے بیر کھلاؤ نا ــــ"

"پھر آپ بھی میری طرح نیچ جاتی کے ہو جائیں گے ــــ"

"دیوالی تو یہ کہہ کر ہنس کر بھاگ گئی اور دھرم راج سناٹے میں آ گیا ــــ

دھرم راج دیوالی کے ساتھ ہنس بول لیتا تھا، لیکن اکیلے پن میں بس یہی خیال مارے ڈالتا تھا ــــ

"پہچان نہ لے کوئی ــــ"

"پہچان نہ لے کوئی ــــ"

بڑی بڑی محفلوں میں مذہب، بھگوان، گیتا، پاٹھ، مندر یا تیرتھ، ان تمام موضوعات سے وہ سخت کتراتا، کیونکہ اس کی زندگی میں ان چیزوں کا کوئی دخل تھا نہ معلومات ــــ جہاں ساری زندگی ہی بڑے لوگوں کے دھکے، جوتے لاتیں کھاتے گذری ہو وہاں ان باتوں کا گذر ممکن بھی کیسے تھا ــــ؟

دن رات یہی دھڑکا اس کے جی کو مارے ڈالتا کہ کوئی میرے ماضی کو نہ کھوج بیٹھے ــــ حالانکہ وہ یہ بات بھی بخوبی جانتا تھا کہ اس کے ماضی کا رازدار سوائے بابا کے اور کوئی نہیں ہے اور بابا پر اسے اپنی ذات سے بھی کچھ زیادہ ہی بھروسہ تھا ــــ اسے ڈر تھا تو صرف یہی کہ اس کے کام ادھورے نہ رہ جائیں ــــ ایک بار اگر لوگوں کا دشواش اکھڑ گیا تو پھر کبھی بات نہ بن پائے گی ــــ لوگ اسکی دھجیاں بوٹیاں کر دیں گے ــــ مذہب کے نام پر اتنا بڑا جوا کھیلا بھی نہیں جا سکتا۔

کم سے کم اتنی دیر تک نہیں کھیلا جا سکتا ـــ اور جو گاؤں کے لوگوں نے اس کے دیالوپن سے متاثر اور بااُمید ہو کر یہ درخواست کی تھی کہ اچھوتوں کے لئے ایک مندر الگ سے بنوایا جائے کہ وہ بھی کسی کے آگے ماتھا ٹیک سکیں تو نہ صرف یہ کہ اس نے حامی بھر لی تھی بلکہ ساتھ ہی یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ اونچی ذات کا برہمن ہونے کے باوجود وہ پہلے دن سب اچھوتوں کے ساتھ مندر میں بیٹھ کر پرارتھنا کرے گا اور بھجن کیرتن کرے گا ـــ !

دیوالی تیار ہو کر آئی تو وہ اُسے دیکھتا ہی رہ گیا ـــ دیوالی کو دیکھ کر پتہ نہیں اس کی ساری فکریں اور وسوسے کہاں پر لگا کر اڑ جاتے تھے اور وہ فوراً ہی ہنستا کھیلتا مسکراتا ایک عام سا نوجوان رہ جاتا ـــ

" ماں قسم آج تو ڈائرکٹ شادی ہی کر لینی پڑے گی ـــ" دیوالی زور سے اس انداز پر ہنس پڑی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی ـــ " آپ کے منہ سے آج پہلی بار ماں کا لفظ سنا ہے ـــ میں نے کبھی پوچھا بھی نہیں۔ آپ کے گھر والے کہاں ہیں ـــ "؟

دھرم راج ایک دم سے رنجیدہ ہو گیا ـــ ماں ـــ ماں ـــ ماں ـــ تم کہتی ہو کہ آج پہلی بار میرے منہ سے یہ لفظ سُنا ہے اور میں کہتا ہوں میرے جیون میں، میری ہر باہر آنے والی سانس میں، میری ہر اندر جانے والی سانس میں ـــ میرے روم روم میں صرف اسی ایک لفظ کی پکار گونجتی ہے ـــ

وہ منہ سے کچھ نہ بولا ـــ مسکرا کر رہ گیا ـــ

"کسی دن اپنی ماں سے ملانے ضرور لے چلوں گا ـــ مگر وہ بات نہیں کر گئی۔

اُسے اب مجھ سے زیادہ نیند پیاری ہے ——"

دیوالی نے دکھ سے دیکھا —— وہ انسان تقدیر جس کے سامنے سرنگوں تھی، دولت جس کے گھر کی باندی تھی، جو جی چاہے خرید سکتا تھا، جسے چاہے خرید سکتا تھا، ماں کے نام پر ایک بچّے کی طرح رونے لگا تھا —— ماں! وہ عظیم محبت جسے ساری دنیا کی دولتیں مل کر بھی نہیں خرید سکتیں ——

گاڑی کے سونا گاؤں پہنچتے ہی مخصوص ہارن کی آواز سُن کر لوگ جمگھٹے کی شکل میں جمع ہونے لگے —— دھرم راج اُن کے لئے بھگوان کا، اوتار کا درجہ حاصل کر چکا تھا —— بغیر کسی مطلب اور چھل کے وہ جو کچھ بھی کر رہا تھا' اِس نے سبھوں کو اس کا بن داموں غلام بنا کر رکھ دیا تھا —— ایک ایک کر کے آنے اور چرن چھونے والوں کا تانتا ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ ہر منہ سے دعا نکل رہی تھی ——

دیوالی نے اپنی آنکھوں نے یہ سب دیکھا اور بڑی شردھا سے بولی ——

"آپ نے میری ضرورت کا ہر سامان لاکر دیا تھا، میں روز سوچتی تھی کہ آپ سے کہوں کہ بھگوان کی ایک مورتی بھی لاکر دیں ..... دھرم راج نے ذرا حیرت سے دیکھا" لیکن میں بھی کتنی نادان تھی۔ بھگوان تو میرے گھر میں —— میرے کمرے میں۔ میرے اپنے دل میں ہی موجود ہے —— مجھے مندر جانے کی بھی کیا ضرورت ہے —— آپ جو میرے بھگوان .....

"مجھے اتنا اونچا نہ اُٹھاؤ دیوالی ——" وہ تیزی سے بولا —— "مت اتنا اونچا اٹھاؤ کہ گروں تو سنبھل بھی نہ سکوں —— مت مجھ پر اتنا اندھا وشواش کرو.....

لوگ باگ چونک کر اسے دیکھنے لگے ...... دیوالی نے اسے گھبرا کر دیکھا، اس کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ آیا تھا ——

اک دم اس نے تیزی سے گاڑی موڑی —— "آج میں تمہیں سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا دیوالی چلو گھر چلیں —— سینے پر اتنا بڑا پہاڑ رکھ کر میں جی نہیں سکوں گا"

دیوالی دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اپنا چہرہ چھپائے ساری داستان سنتی رہی —— سنتی رہی وہ کہتا رہا —— کہتا گیا ——

"اب خدا کے لئے مجھے اونچے اونچے ناموں سے مت پکارنا ——"

وہ شرارت سے بولی —— "اب تو میں آپ کو خود سے اور بھی زیادہ قریب پا رہی ہوں —— ایسا لگ رہا ہے کہ آپ میں اور مجھ میں جو ایک فرق تھا، اونچ نیچ کی جو دیوار تھی وہ ڈھے گئی ہے اور میں بڑی آسانی سے آپ کو چھو سکتی ہوں —— پا سکتی ہوں ——"!

اُس رات فانوس میں جلتے ہوئے چراغوں کو دیوالی ایک ایک کر کے بجھا چکی اور اندھیرا اپنا تسلط جما چکا تو دھرم راج جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں بولا —— "تمہیں پتہ ہے دیوالی تم سارے چراغ بجھا دیتی ہو تو بھی ایک چراغ روشن رہ جاتا ہے —— تمہارے چہرے کا چراغ —— جس سے میری زندگی میں روشنی ہے"!

سونا گاؤں کا نقشہ ہی چند مہینوں میں کچھ سے کچھ ہو گیا —— پکی سڑکیں بن گئیں —— اسکول کھڑا ہو گیا —— ہاسپٹل تیار ہو گیا —— نسبتاً بڑی لڑکیوں کیلئے سلائی کڑھائی

کے سینہ بھی کھل گئے ـــــ بوڑھے اور کمزور بوڑھوں کو، جن سے کھیتی کی مشقت ناممکن تھی، گھر بیٹھے آمدنی کے لئے بھینس بھائیں دلادی گئیں۔ کسی نے فرمائش کی تو پولٹری فارم کھلوا دیا گیا۔

اور اُس دن گاؤں کے بیچوں بیچ جو ایک بہت ہی زرخیز اور شاداب لمبی چوڑی کھیتی تھی اُس کی بات چیت کے لئے دھرم راج تلے ہوئے تھے ـــــ

چھوٹے زمیندار نے حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کر دھرم راج کو دیکھا ـــــ

"اتنا بڑا کھیت آپ سنبھال نہ پائیں گے" !

"مجھے سنبھالنا ہے بھی نہیں ـــــ وہ میں اپنے لئے نہیں لے رہا ہوں ـــــ ایک اچھوت خاندان کے ۴۰۔۵ گھرانوں کی کھیتی کے طور پر انھیں تحفہ دینا چاہتا ہوں ـــــ

"قیمت" ـــ؟ چھوٹے زمیندار نے بھویں اٹھا کر رعونت سے پوچھا ـــــ

میں نے آج تک کبھی قیمت کی بات کی ہے ـــ؟ جو مناسب ہو ـــــ" اور ذرا ہنس کر کہا ـــ" جو آپ کی جیب کو بھاتی ہو ـــــ"

بڑے زمیندار نے ہاتھ اٹھا کر بات روک دی ـــ" لیکن وہ کھیت تو عین گاؤں کے بیچ میں ہے۔ اس طرح تو بیچ جاتی کے لوگ ہم پر مسلط ہو جائیں گے......

دھرم راج انگلی اٹھا کر بولا ـــــ

That is the main point

یہی وجہ ہے کہ میں خاص طور سے وہی زمین خریدنا چاہتا ہوں جو اچھوتوں کو ہمارے بیچ لے آئے۔ میں گاؤں کے پرلی اور سرحدی کناروں پر ہریجن بستیاں بنانے کے خلاف ہوں۔ اسی طرح تو صدیاں بڑھتی ہیں ـــــ میں چاہتا ہوں کہ انہیں دور کونے

کھدروں میں نہیں ـــــ اپنے بیچ میں اپنے قریب، اپنے دل میں بساؤں، تاکہ دوئی کے فاصلے مٹ جائیں ـــــ

لیکن دھرم راج جی آپ یہ بات بھول رہے ہیں کہ برسوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دھرم راج نے بڑے زمیندار صاحب کی بات وہیں کاٹ دی ـــــ

" میں جانتا ہوں آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں یہی ناکہ برسوں سے یہ فاصلے قائم ہیں؟ لیکن یہ فاصلے قائم کس نے کئے ہیں ـــ؟ ہمیں نے نا؟ اور ہمیں انھیں توڑیں گے بھی۔ اور سچ پوچھئے اگر ہم نہ توڑیں تو اور کون توڑ سکتا ہے؟؟

وہ مسکرا کر دونوں باپ بیٹوں کو دیکھنے لگا ـــــ

بڑے زمیندار کو کچھ نہ سوجھا تو اٹھ کر تیزی سے ٹہلنے لگے ـــــ چھوٹے ٹھاکر اس وقت باپ کی کوئی بات سننے کے موڈ میں نہ تھے ـــــ منہ مانگی قیمت کا نشہ کرو زمین بیچنے پر آمادے ہوئے جا رہے تھے ـــــ

دھرم راج کو وہیں چھوڑ کر وہ باپ کو اندر لے جا کر سمجھاتے ہوئے بولے ـــــ

" پتا جی ـــــ آپ بات کی نزاکت کو نہیں سمجھتے۔ منہ مانگی قیمت کوئی الو کا پٹھا ہی دے سکتا ہے۔ ایک لاکھ قیمت کے کھیت کے پانچ پانچ لاکھ وصول کروں گا ـــــ سب سے بڑی طاقت پیسہ ہے پیسہ ہو تو ہر جگہ جائداد خریدی جا سکتی ہے اور ہر جگہ حکومت کی جا سکتی ہے۔"

" بڑے زمیندار نے دھرم راج پر اپنا غصہ اتارا ـــــ"

" الو کا پٹھا ـــــ بڑا دیش سدھار بنتا ہے، ہماری پوزیشن بگاڑ رہا ہے ـــــ اور اوپر سے تم ہو کہ گاؤں کے بیچ اچھوتوں کو آباد کرنے میں اس کا ساتھ دینا چاہتے ہو ـــــ ہمارے پرکھوں نے کبھی ایسی انہونی ہوئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لیکن باپ کو بک بک کرتا چھوڑ چھوٹا ٹھاکر پھر سے دھرم راج کے پاس آ گیا تھا۔ "آپ کل تشریف لے آیئے گا غذات تیار کروالیں گے ___" پھر اندر کی طرف اشارہ کر کے بولا ___" پتاجی کی باتوں پر آپ کان نہ دیں پرانے لوگ ذرا نئے لوگوں کی بات ذرا مشکل سے ہی مانتے ہیں ___"

دھرم راج مسکرانے لگا ___ پھر ذرا بن کر بولا ___

" یہ ادھر اُدھر کے جو گاؤں ہیں ___ جیسے چنداپور۔ وہاں آپ کی کوئی زمین کھیتی بکاؤ نہیں ہے ___" ؟

چنداپور کے نام پر چھوٹے ٹھاکر کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گذر گیا۔ نفرت سے بولا ___" دھرم راج جی ___ وہاں کے اچھوت تو اور زیادہ پنچ ہیں۔ آپ سے بن نہیں پائے گا اُن کو سنبھالنا ___"

"اور جب میں خود ہی ان میں مل جاؤں ___ تو ___" ؟ اور واقعی وہ اپنی دھن میں مگن تھا ___

اور یہ سب کچھ محض ایک اور ایک ہی شخص کی بدولت تھا ___ دھرم راج ___ دھرم راج ___ دھرم راج ___ گاؤں والوں کی زبان پر صرف ایک ہی نام تھا۔ ایک ایسا نام جو اُن کے لئے بھگوان کے سمان تھا ___

گاؤں میں ایک بچے کے چیچک نکلی ___ دھرم راج ہر کام جو کسی سے اپنی نگرانی میں کرواتے تھے ___ فوراً گاؤں بھر کے لوگوں کے لئے چیچک کے ٹیکوں کا انتظام کیا گیا ___

"ایک صحت مند معاشرہ ہی بہتر زندگی کی بنیاد رکھ سکتا ہے ___"

دھرم راج کا اُصول تھا ــــ

حویلی والوں نے طوفان اُٹھا کر کھڑا کیا ــــ " جن سوئیوں سے یہ نیچ خون والے انجکشن لیں، کیا ہم بھی انہی سے لیں ــــ " ؟ چاپلوس بھٹناگر ہاں میں ہاں ملائے گیا ــــ

" بھگوان نے سب کا خون یکساں ایک ہی رنگ کا بنایا ہے۔ وہ ایک ہی طرح رگوں میں دوڑتا ہے ــــ خون میں بھی اونچ نیچ آگئی ــــ ؟ لگاؤ بھائی اُسی سوئی سے مجھے بھی ٹیکہ، جس سے تم نے ابھی ابھی کلوا ڈھیڑ کو لگایا ہے ــــ "

اور دھرم راج نے اپنا صحت مند گورا گورا بازو آستین سے ہٹا کر سامنے کر دیا " اسے کہتے ہیں جی سچّا ریفارمر ــــ " ڈاکٹر نے چاپلوسی دکھائی اور روئی سے بازو صاف کرنے لگا ــــ " ایک دم وہ بازو دیکھ کر ذرا چونکا ہوا ــــ

" پدم ــــ " ! چاند کا نشان ــــ ؟ جناب بزرگوں سے جیسا سُنا تھا ویسا ہی اس نشان کا اثر پایا " ؟

" کیا سُنا تھا بھائی بزرگوں سے ــــ " ! دھرم راج مُسکرا کر منہ پھیرتے ہوئے بولا ــــ

" ارے جناب ہم انگریزی پڑھ، لکھ بھی گئے تو کیا ہوا ــــ اپنے پرکھوں بھگوان کی بات پر ایمان اور وشواش تو رکھتے ہی ہیں ــــ یہ صاحب جو آپ کے بازو پر چاند کا نشان ہے نا بڑے بوڑھے کہتے ہیں یہ پیدائشی نشان عمر بھر نہیں مٹتا اور جس کسی کو بھگوان یہ نشان دے، اس کے اپنے بھاگوان ہونے میں کوئی شک نہیں ــــ سو صاحب آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ــــ "

دھرم راج آستین نیچی کرتے ہوئے مسکرا کر بولے ــــ " چلئے صاحب ایک چشم دید گواہ تو آج ملا ــــ پھر ذرا رک کر بولے ــــ ڈاکٹر صاحب آپ سے ایک فریادی

بات یہ کہنی تھی کہ یہ فیملی پلاننگ والے تو لاکھ چیختے رہیں، ہمارے بھائی لوگ تو بچے پیدا کرتے ہی رہیں گے تو ہاسپٹل میں ایک دو تجربہ کار لیڈی ڈاکٹر رکھنی تھیں مجھے۔

— آپ کا تو یہ فیلڈ ہے — کوئی جان پہچان کی ڈاکٹر ہو تو مجھ سے کہئے گا —"

ایک ڈاکٹر تو میری پہچان کی ہے شانتی ڈالے ——

بہت تجربہ کار بھی ہے، مگر کچھ سر پھری ہے۔ پہلے اس کا اپنا میٹرنٹی ہوم بھی تھا۔ پتہ نہیں کیا جی میں آئی، بیچ دیا — اب نوکری بھی نہیں کرتی اور ہاسپٹل بھی نہیں رکھا۔"

"بات کر کے تو دیکھئے ذرا —"

"ارے صاحب بات کر کے کیا دیکھوں گا، راضی کر کے ہی لوٹوں گا — آپ جیسے بھگوان آدمی کا کام کون نہ کرے — اس گاؤں میں سانچا آدمی تو بس آپ ہی ہیں سرکار — باقی تو سب نام کے ہی بڑے ہیں — کوڑی کوڑی سینے سے لگا کر رکھنے والے —"

دھرم راج کے ڈسپنسری سے نکلتے ہی دوسرے لوگ آنے شروع ہو گئے — ڈاکٹر کا وظیفہ جاری تھا —

"ارے صاحب، ہم بھلے ہی انگریزی اور سائنس پڑھ لکھ گئے، لیکن اپنی مان مریادا تو نہیں بھول سکتے — اپنے ہی ہاتھوں کیسے ایک ہی سوئی سے برہمن اور اچھوت دونوں کو ایک ساتھ ٹیکہ لگائیں —"؟

ڈاکٹر بابو — آپ کو بڑے زمیندار نے حویلی پر بلایا ہے —" کسی آدمی نے آ کر کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا —"

ڈاکٹر صاحب کو جہاں چار پیسے زیادہ ملنے کی آس ہوتی فوراً وہاں پہنچ جاتے کیونکہ دھرم راج جی کی ایسی کوئی پابندی ان پر نہ تھی کہ ہاسپٹل کے نوکر ہوتے باہر کے مریض

اسٹنڈ نہ کریں۔ جی بھر کے دولت سمیٹ رہے تھے۔ اور دلوں میں نفرت کے بیج بھی خوب بو رہے تھے — کوئی دن جاتا تھا کہ یہ فصل پک کر تیار ہو جاتی —

" وہ دھرم راج کا بچہ کیا کہہ رہا تھا "؟

بڑے رائے صاحب نے گرج کر پوچھا —

ڈاکٹر صاحب نے سہمی شکل بنا کر جواب دیا — " صاحب انہوں نے تو اُسی سوئی سے انجکشن لگوایا جس سے تھوڑی دیر پہلے ایک چمار بھنگی کو لگ چکا تھا "

" ہوں — ! " وہ تھوڑی دیر چپ رہے —

سارے گاؤں کا ناس مار دیا — اب سنا ہے دوسرے آس پاس کے گاؤں پر بھی دستِ شفقت پھیرنے والا ہے — "

" جی ہاں جناب — ان کے ارادے تو بہت بڑے بڑے ہیں — اور صاحب بھگوان نے دولت بھی تو خوب دل کھول کر دی ہے اور دل بھی خوب دیا ہے۔

واہ — " واہ واہ " — رائے صاحب گرجے — آپ واہ واہ کر رہے ہیں۔ اور یہاں برسوں کی بنائی ہوئی عزت خاک ہو رہی ہے۔ جس کنوئیں سے ہمارے کھیتوں کو پانی جاتا ہے اسی سے چمار زادے بھی پانی لے رہے ہیں — جیسا اناج ہم کھاتے ہیں، وہ حرام خور بھی جوار باجری چھوڑ کر چاول گیہوں کھا رہے ہیں۔ بد معاش کا بچہ انھیں ہائی برڈ سیڈ سپلائی کرتا ہے۔ گاؤں کے بچے لفنگے بھی، ہماری ہی طرح کے لباس پہننے لگے ہیں — سڑک پر نکلے تو حویلی کی بہو اور گاؤں کی منیارن میں کوئی فرق محسوس نہیں ہو سکتا — اور تو اور نیچ ذات کے گندے انڈے فر فر انگلش اور صحیح ہندی بول رہے ہیں — اور آپ واہ واہ کر رہے ہیں " !

"تو پھر صاحب میں کیا کروں ۔"
لوگوں کے دلوں میں پھوٹ ڈالئے ۔۔۔ نفرت بھریئے۔ آپ پڑھے لکھے ہیں
یہ کام زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں ۔۔۔"
" صاحب مگر میں نوکر تو دھرم راج جی کا ہوں ۔۔۔"
رائے صاحب گرجے ۔۔۔" تو ہم کس اُلّو کے پٹھے کے مالک ہیں پھر ۔۔۔" ؟
اور انھوں نے ایک موٹی سی گڈی ان کے آگے پھینکدی ۔۔۔! ڈاکٹر صاحب حویلی
سے نکلے تو ایک کتّا جھوٹی ہڈی چچوڑتا بیٹھا تھا ۔۔۔

شانتی ڈاملے کسی حال اپنا ارادہ بدلنے پر راضی نہ تھیں ۔۔۔
"کمال ہے ۔۔۔ ڈاکٹر بھٹناگر چڑھ کر بولے ۔۔۔ بیٹھے بٹھائے ہزار روپے
مہینے کی آمدنی ٹھکرا رہی ہو ۔۔۔ آخر لوگ ڈاکٹر سیوا کرنے کے لئے ہی بنتے
ہیں۔ کوئی گھر بیٹھنے کے لئے نہیں ۔۔۔"
" نہیں ڈاکٹر صاحب پلیز۔ آپ مجھے فورس نہ کریں ۔۔۔ میں نے طوفان کی سی
بھیانک ایک پوری زندگی گذاری ہے ۔۔۔ اب کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے۔ کھانے بھر کو
اتنا تو بھگوان نے دے رکھا ہے کہ روکھی سوکھی عمر بھر کھا سکوں ۔۔۔"
" ارے جب گھی سے تر تراتی ملتی ہے تو روکھی سوکھی کیوں کھاؤ بھئی ۔۔۔"
یہ بھی ایک طرح سے اپنے گناہوں کا پرائشچت کرنا ہے ۔۔۔"
ڈاکٹر صاحب ہنسے ۔۔۔" ارے واہ تم جیسی نیک دیوی بھی کوئی گناہ کر سکتی
ہے جس کا پرائشچت کرنا پڑے ۔۔۔"

"ہاں ڈاکٹر صاحب ـــ میں نے تو ایسا گناہ کیا ہے کہ گنگا میں ایک بار ڈبکی تو کیا ساری عمر کے لئے گنگا میں ڈوب کر رہ جاؤں تو بھی وہ داغ نہیں دُھلے گا ـــ زندگی میں کبھی مذہب، دھرم بھگوان کو نہیں مانا۔ لیکن اب دن رات یہی چنتا کھائے جاتی ہے کہ بھگوان کو کیا مُنہ دکھاؤں گی ـــ"؟

"آخر بات کیا تھی ـــ مجھ سے بتاؤ تو ـــ دل ہی ہلکا ہو جائیگا ـــ"

ہاں ڈاکٹر صاحب ـــ میں مرنے سے پہلے کم سے کم کسی ایک انسان کو تو یہ بات بتا دوں۔ اتنا بڑا بوجھ میں تو اٹھا بھی لوں ـــ ارتھی اُٹھانے والے پیس کر رہ جائیں گے ـــ"

شانتی ڈامیلے کہتی گئیں ـــ آنکھیں پھاڑے ڈاکٹر بھٹناگر سنتے گئے....

"ہائے کیسا گل گوتھنا سا بچہ تھا ڈاکٹر صاحب، کیسا بھاگیہ وان ـــ ماتھے پر سچ مچ کے چاند جیسا پدم کا نشان ـــ اور میں نے اپنے بدلے کی آگ میں اُسے ایک نیچی جاتی والی عورت کی بچّی سے بدل دیا! اب سوچتی ہوں کہ اس سے بڑا پاپ کوئی بھی عورت کر سکتی ہے ـــ؟ ننھی سی جان جو ہزاروں لاڈ پیار سے نازونعم سے پلتی، جانے کن کن مصیبتوں کا شکار ہوئی ہو ـــ رائے زادہ اشوک چکرورتی کی اولاد اچھوت بن گئی!"

"پھر بعد میں اس کا کچھ پتہ چلا ـــ"؟ ڈاکٹر بھٹناگر کی آنکھوں میں ایک شیطانی چمک پیدا ہوئی ـــ

"کوئی نہیں ـــ جس عورت کی بچّی سے میں نے اسے بدل دیا تھا، بعد میں میں نے پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ زمیندار کے کارندوں کی وجہ سے اس نے کنوئیں میں ڈوب کر خودکشی کر لی تھی ـــ دونوں لڑکیوں کی لاشیں بھی کنوئیں سے ملی تھیں۔

پورا خاندان بھی تباہ ہو گیا تھا ـــــ سنا تھا بعد میں وہ لڑکا گاؤں چھوڑ کر سشہر بھاگ گیا تھا ـــــ کوئی بارہ تیرہ برس کی عمر میں ....

"پھر ـــــ"؟

"پھر ـــــ"؟ دنیا بہوت بڑی ہے ـــــ بہوت بڑی ہے ـــــ اور انسان اس عظیم اور وسیع سمندر میں ایک قطرہ !! اور پہچان کے لئے محض ایک چاند کا نشان، وہ بھی بانہہ پہ جو آستین میں چھپی رہتی ہے ـــــ ! کون کیسے ڈھونڈھ سکتا ہے ـــــ بس بھگوان ہی بچھڑوں کو ملا سکتا ہے۔ اور کوئی نہیں ـــــ"

"تو میں چلوں شانتی جی ـــــ مگر کوشش کرو کہ دل کو آمادہ کر سکوں۔ لوگوں میں گھری رہو گی تو غم اور گناہ دونوں کا بوجھ ہلکا کر سکو گی ـــــ"

دھرم راج کے شاندار آفس میں ایک بڑے سے خوبصورت فریم میں مہاتما گاندھی کی ایک تحریر آویزاں تھی ـــــ

"میں بھگوان سے پرارتھنا کروں گا کہ مرنے کے بعد اگر دوسرا جنم ملتا ہے تو میں ہریجن بنا کر پیدا کیا جاؤں ـــــ"

ڈاکٹر بھٹناگر دھرم راج کے آفس میں بیٹھے بڑی دیر سے اس فریم کو تکے جا رہے تھے ـــــ دھرم راج مڑا اور ہنس کر بولا ـــــ

"کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب ـــــ بڑے سوچ بچار میں بیٹھے ہیں ـــــ"

"نہیں صاحب بات کیا ہوتی، سوچ رہا ہوں مہاتما گاندھی جی کتنے بڑے آدمی تھے ـــــ کیا ہی اچھی بات کہی ہے ـــــ واہ ـــــ واہ صاحب واہ ـــــ"

دھرم راج نے ہزار بار کے دیکھے ہوئے فریم کو نئے سرے سے مڑ کر دیکھا ـــــ پھر اچنبھے سے ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر اپنے کاغذات پر جھک گیا ـــــ

" مگر ایسے فریم تو نیچ ذات والوں کو ــــ میرا مطلب ہے اچھوتوں کو اپنے گھروں اور دیواروں پر لگانے چاہئیں ــــ آپ تو...... اور انھوں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

دھرم راج اک دم گڑبڑا گیا ــــ وہ گھبراہٹ میں ہنسا ــــ پھر سنجیدہ ہوا۔ پھر ہنسا۔ اس کے چہرے پر پسینہ پھوٹ نکلا ــــ اس نے بات سنبھال لی۔

" ہم نام کے برہمن ــــ کون سے ہمارے کام ایسے ہیں کہ برہمن کہلا سکیں ــــ اسی لئے یہ فریم ٹانگ بھی رکھا ہے کہ اپنی اوقات یاد آتی رہے ــــ" وہ زور سے ہنسا ــــ مگر ڈاکٹر بھٹناگر کی تیز نگاہوں کے سامنے اسے محسوس ہوا کہ قہقہہ کچھ پھیکا پڑ گیا ہے ــــ

بات کرنے کی خاطر بات کرنی تھی ــــ" پھر آپ نے کسی لیڈی ڈاکٹر کا انتظام کیا ــــ" ؟

ڈاکٹر بھٹناگر اسے دیکھے ہی گیا ــــ جواب کچھ نہ دیا۔

دھرم راج یکایک اکھڑ سا گیا ــــ

" آپ غلط سمجھ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب...... میں...... م...... مم...... آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا کہ آپ اچھوت نہیں ہیں ــــ تو صاحب میں بھی کب کہہ رہا ہوں ــــ میں نے تو بات جیسی بات کی تھی ــــ آپ یہ کہاں کے بکھیڑے لے بیٹھے ــــ

تھوڑی دیر تک ماحول میں تناؤ سا رہا ــــ پھر ڈاکٹر بھٹناگر بڑی منّت سی لجاجت سے بولا ــــ

صاحب آپ تو بڑے دیالو ہیں ــــ بھگوان کی کرپا سے بھگوان سمان ہی ہیں ــــ

یہیں شہر میں بیوی کو ایک پلاٹ پسند آ گیا ہے۔ صاحب اس حکومت میں ایک ڈاکٹر کی اوقات ہی کیا ــــ تیس ہزار کا پلاٹ آپ کے لئے کچھ نہ ہی، مگر ہمارے لئے تو زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اور وہ دھرم راج سے نظریں ملائے بغیر مہاتما گاندھی کے فریم کو تکنے لگا ــــ

دھرم راج تھوڑی دیر تو یونہی سُن بیٹھا رہا، پھر دھیرے سے اٹھا، سیف کھول کر تیس ہزار کے بنڈل نکالے اور ڈاکٹر بھٹناگر کے سامنے رکھ دیئے ــــ

ڈاکٹر اٹھ کر چلا گیا تو دھرم راج نے اپنے آپ کو سنایا ــــ

دھرم راج ــــ میں خود عنقریب تمہاری پول کھول دوں گا ــــ صرف چند اہم کام اور سرانجام دے لوں ــــ اور ڈاکٹر کے بچے ــــ وہ دروازہ کی طرف دیکھ کر دانت پیس کر بڑبڑایا ــــ

" تم سے ــــ تجھ سے کسی دن سمجھ لوں گا ــــ اس وقت تو میں تیری مٹھی میں ہوں ۔"

اُسی رات کو کھانے کی میز پر دھرم راج نے بغیر کسی پس و پیش یا شرم کے، بڑے بوکھلائے ہوئے سے انداز سے بابا سے کہا ــــ

" بابا اگر آپ کی اجازت ہو تو کل میں اور دیوالی شادی کر لیں ــــ" !!

دیوالی نے پریشانی سے اُسے دیکھا ــــ " کہیں دھرم راج کا دماغ تو نہیں پھر گیا ــــ جو کمبخت کھلا بابا سے یوں بات کر رہا ہے ــــ"

" بابا نے اس کی پریشانی بھانپ کر توڑا ہوا نوالہ حیرت سے پلیٹ میں رکھ دیا ــــ کیا بات ہے بیٹا ــــ تم اتنے پریشان تو کبھی نہ دکھائی دیئے ــــ"

www.taemeer

وہ پلیٹ سامنے سے ہٹا کر کرسی سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا ـــ دیوالی اور بابا سے نظر ملائے بغیر اُس نے بڑی مشکل سے رک رک کر جملہ پورا کیا ـــ

"بابا جس بات سے میں ڈرتا تھا کہ کہیں پہچان نہ لیا جاؤں ـــ پکڑ نہ لیا جاؤں ۔ وہی بات ہو گئی ـــ کچھ لوگوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ میں اچھوت ہوں ۔ بات پھیلتے دیر نہیں لگتی ـــ بابا ـــ وقت کسی کے ساتھ مہربانی نہیں کرتا بابا ـــ وہ اپنا چکر چلائے جاتا ہے ۔ کون جانے وقت کا بے رحم پہیہ کب مجھے اور دیوالی کو اٹھا کر دور دور پھینک دے ـــ اسی لئے بابا ـــ وہ انتشار کی حالت میں کھڑا ہو گیا ـــ اسی لئے بابا میں چاہتا ہوں کہ تھوڑی بہت جو بھی خوشیاں میرے نصیب میں ہوں انھیں سمیٹ لوں ۔"

دیوالی کی سسکی کی آواز سُن کر وہ پلٹا ـــ "رو رہی ہے پاگل ـــ پریشان ہونے کے لئے میں اکیلا کافی نہیں ہوں کیا ـــ؟"

بابا نے اُٹھ کر دیوالی کے سر کو پیار سے تھپکا ـــ "بیٹا خدا اپنے نیک بندوں کی ہی آزمائش کرتا ہے ۔ اٹھو دعا کرو ـــ گھبراؤ نہیں ۔ دُعا میں بڑی طاقت ہے ـــ خدا سب ٹھیک ہی کرے گا ـــ"

توقع کے برخلاف ایک دن لیڈی ڈاکٹر شانتی رام لے سونا گاؤں ہاسپٹل پہنچ گئیں ۔

تنہائی کا بوجھ ـــ گناہوں کا بوجھ ۔ ندامتوں کا بوجھ ۔ آخر اکیلا انسان کتنے بوجھ ڈھو سکتا ہے ـــ بیٹھے بیٹھے انھوں نے سوچا ممکن ہے کسی کی خدمت کے صلے میں ہی اُن کے دامن پر لگے گناہ کے سارے داغ بھی دھو دے ـــ

ڈاکٹر بھٹناگر اُسے دیکھتے ہی ہڑبڑا گئے ——

"ارے تم ڈاکٹر —— خیریت تو ہے ——"

"آپ کے اصرار نے —— اور میرے اپنے حالات نے یہی سمجھایا کہ خود کو مصروف رکھنے میں بھلائی ہے —— میں دھرم راج جی سے ملنا چاہتی تھی۔ آپ نے اُن کے بارے میں مجھ سے کہا تھا نا؟ ——"

ہاں —— آں —— ہاں —— وہ گڑبڑائے —— وہ تو ٹھیک ہے —— لیکن وہ تو شہر میں یا رہتے ہیں اور بہت مصروف ہیں، کبھی کبھار ہی لوگوں سے ملتے ہیں —— میں خود اُن سے مدت سے نہیں مل پایا۔"

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اسی دوران وہ تین بار دھرم راج سے مل چکے تھے اور اب تک ایک لاکھ کا ٹوٹا پورا کر چکے تھے —— شانتی ڈاسلے کو دیکھ کر انھیں وحشت سی ہو گئی کہ "وقت وقت ہی کی بات ہے، کبھی بھگوان ذکرے اُس نے دھرم راج کا بازو دیکھ لیا اور یوں پتہ چل گیا کہ یہی وہ سپوت ہے، تو پھر تو یہ ہزاروں کی آمدنی ہی گئی —— بتا تو وہ بے وقوف دھرم راج خود ہی برہمن بچہ —— مگر خود کو اچھوت سمجھے بیٹھا تھا —— اور اچھوت پن کو چھپانے کے ہزاروں روپے دیئے جا رہا تھا ——"

شانتی ڈاسلے اٹھ کر جا ہی رہی تھیں کہ باہر کار رکنے کی آواز آئی' دربان کی آواز اور ان کا ملا جلا شور اٹھا —— اچانک دھرم راج اندر داخل ہوا ——

"آئیے آئیے —— دھرم راج جی —— ڈاکٹر بھٹناگر اس بے وقت کی اچانک آمد سے حد درجہ پریشان ہو کر گڑبڑاتے ہوئے اٹھے اور کرسی پیش کی ——

بیٹھنے سے پہلے ایک مہربان اور شفیق صورت عمر رسیدہ، صورت سے پڑھی لکھی خاتون کو دیکھ کر دھرم راج ٹھٹک سا گیا اور اخلاق سے پوچھا ــــ

"آپ کی تعریف ــــ"؟

ڈاکٹر بھٹناگر نے بدلی سے تعارف کرایا ــــ

"لیڈی ڈاکٹر شانتی ڈاملے ــــ"

"اچھا اچھا ــــ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے ــــ" آپ کے بارے میں تو مدت سے سن رہا تھا ــــ بڑے سوبھاگیہ میرے جو یوں آپ سے ملاقات ہو گئی ــــ

شانتی ڈاملے انکساری سے مسکرانے لگی ــــ

"تو پھر آپ ہمارے ہاسپٹل کا چارج لے رہی ہیں ماں جی ــــ"؟

"ماں جی"ــــ؟ شانتی نے گھبرا کر دھرم کو دیکھا ــــ

محبت بھی انسان کو بیبس کر رکھ دیتی ہے ــــ شانتی میں "نہیں" کہنے کی اب تاب ہی کہاں رہ گئی تھی ــــ آبدیدہ ہو کر بولی ــــ

"جب ماں کہہ دیا بیٹا تو پھر انکار کی جگہ ہی کہاں رہ جاتی ہے ــــ"

ڈاکٹر بھٹناگر نے بے موقع بے توڑ بات شروع کی ــــ "دیکھنا حویلی والوں کے ہاں سے بلاوا آئے بھی تو نہ جانا ــــ"

"لیکن میری طرف سے تو کوئی منع ہی نہیں ہے آپ لوگوں کو ــــ" دھرم راج نرمی سے بولا ــــ

"وہ تو ٹھیک ہے آپ بھلے بھاگوان آدمی ہیں ــــ وہ لوگ تو نام کے ہی برہمن ہیں بڑے خبیث قسم کے لوگ ہیں ــــ"

دھرم راج اسی رو میں کہے گیا ــــ "چھوٹے سرکار کے بارے میں تو زیادہ نہیں

کہہ سکتا لیکن رائے صاحب اشوک چکرورتی تو خاصے سلجھے ہوئے آدمی ہیں ۔
پھر ذرا مسکرا کر بولا ــــ "بس ذرا غصّہ جلدی ہو جاتے ہیں ــــ پیسے والے ہیں نا ــــ"
اس کے لہجے میں طنز چھپا نہ رہ سکا ۔ لیکن شانتی ڈاملے کچھ نہیں سن رہی تھیں ــــ
"ہائے ری قسمت پھینکا بھی تو کہاں لاکر ــــ لیکن اب تو اس جال میں ہاتھ پاؤں
ایسے پھنس چکے ہیں کہ چھٹکارا ممکن ہی نہیں ــــ"
ڈاکٹر بھٹناگر دھرم راج کے پیچھے پیچھے لپکے ــــ
"صاحب آج اچانک ادھر آنا کیسے ہو گیا تھا ؟ ۔
دھرم راج نے اُسے معنی خیز نظروں سے گھور کر کہا ــــ
"ایسا لگتا ہے کہ زندگی کے چند ہی روز باقی رہ گئے ہیں ــــ اسی لئے سوچتا
ہوں کہ جلدی جلدی بہت سی نیکیاں اور پُن کر ڈالوں ــــ اطراف کے چار گاؤں
میں اسکول اور ہاسپٹل کے لئے زمین خرید تا پھرا ہوں ــــ !
"دھن ہو ــــ دھنیہ ہو ــــ ڈاکٹر بھٹناگر نے پیشہ ور سادھوؤں کے
انداز میں الاپنا شروع کر دیا ــــ
دھرم راج جاتے جاتے مڑا ــــ "دیئے سے دیا جلتا ہے ــــ میں نے سوچا تھا
ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں ــــ دوسرے سے تیسرے ــــ اس طرح جہاں
تک ممکن ہو سکے روشنی پھیلاتا جاؤں گا کہ ایک حد وہ آ لگے کہ لوگ مٹھیوں میں
بھر بھر روپے خیرات کرنے کو نکلیں اور کوئی لینے والا نہ ملے ــــ لیکن ڈاکٹر بھٹناگر
ــــ جس طرح ایک دیئے سے دوسرا دیا جلتا ہے ، اسی طرح زہریلی ہوا کے ایک ہی
جھونکے سے ایک ایک کرکے سارے دیئے بجھ بھی جاتے ہیں ــــ"
اس نے اپنے پیچھے زور سے دروازہ بند کیا اور مڑ کر دیکھا تک نہیں ــــ

پتہ نہیں بابا کی رائے میں کون سی مصلحت تھی مگر انھوں نے دھرم راج سے یہ کہا تھا کہ ابھی فی الوقت دھوم دھڑاکے سے شادی ترک کرو ــــ مندر میں جاکر مالے بدل شادی کرلو ــــ ریسپشن بعد میں ہوتا رہے گا۔ اور دھرم راج نے ہر بات کی طرح بابا کی یہ بات بھی مان لی تھی اور اگلا سنیچر شادی کے لئے طے کیا تھا کہ اچانک بیر کو سوناگاؤں سے چند لوگ آگئے ــــ اتفاقاً مندر کے ادگھاٹن کا دن بھی سنیچر ہی قرار پایا تھا۔ اور چونکہ دھرم راج وعدہ کر چکے تھے کہ سارے اچھوتوں کے ساتھ مندر میں پرارتھنا کریں گے اس لئے ناممکن تھا کہ وعدہ پورا نہ کرتے ــــ شادی کی بات تو ٹل گئی لیکن یہ بھی طے رہا کہ بابا اور دیوالی بھی سنیچر کو مندر پرارتھنا میں ضرور جائیں گے ــــ

جب دھرم راج کی شاندار گاڑی سوناگاؤں کے سامنے جاکر رکی ہے تو بھیڑ کا عالم دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا ــــ آگے منڈپ تنا ہوا تھا جس میں خوب جھکا جھک اجالا ہو رہا تھا ــــ

سامنے نرم اور گدیلے صوفوں پر شہر سے آئے ہوئے، اور گاؤں کے بڑے لوگ، سماجی مرتبے دار لوگ، برہمن لوگ، ــــ پیسے والے لوگ براجمان تھے۔ جو بس چلتا تو ہرگز اس محفل میں نہ آتے، لیکن چونکہ اب اس کام کی نوعیت کچھ کچھ سیاسی بھی ہو گئی تھی اور حکومت وقت کا ساتھ نہ دینا غیر دانشمندی میں شامل تھا۔ اس لئے آکر بیٹھ تو گئے تھے مگر سخت بری بری صورتیں بنا رہے تھے ــــ

سامنے شطرنجیوں پر نیچی جاتی کے لوگ، مرد، عورتیں، بچے بھرے بیٹھے تھے ــــ پھر اسکولوں کے ماسٹر ــــ ہسپتالوں کے ڈاکٹر کمپوڈر، زمین اور پورا عملہ اور صرف سوناگاؤں کا ہی نہیں، ادھر ادھر آس پاس جتنی بھی جگہوں پر دھرم راج نے

اپنی مہربانیوں سے روشنی پھیلائی تھی ـــ سبھی موجود تھے ـــ ایک قطار میں صوفوں پر رائے صاحب اشوک چکرورتی ان کی دھرم پتنی ـــ ان کے بڑے بیٹے۔ چھوٹی بیٹی سلیکھا ـــ ان سے ہٹ کر ڈاکٹر بھٹناگر ـــ ڈاکٹر شانتی ڈاملے ـــ ڈائس پر تیز روشنی میں دو تین سیاسی نیتاؤں کے ساتھ دھرم راج بیٹھے ہوئے تھے نیچے پہلی قطار میں بابا اور دیوالی نظر آ رہے تھے ـــ

مدتوں بعد آج شانتی ڈاملے نے اشوک رائے کو دیکھا تھا ـــ سینے میں جذبات اور کڑوی کسیلی میٹھی کسکتی یادوں کا طوفان موجزن تھا ـــ ایک دل کہتا تھا کہ جا کر کہہ دیں ایسی ایک بھول زندگی کا روگ بن گئی ہے ـــ پھر سوچتیں اس نے بھی تو میری زندگی کو ایک بھنور میں لا چھوڑا تھا ـــ

ایک دل کہتا تھا اپنے گناہوں کا راز خود ہی کھول دیں ـــ پھر سوچتیں اگر وہ پوچھ بیٹھا کہ میرا لال میرا جگر کا ٹکڑا کہاں ہے ـــ تو میں کہاں سے لاؤں گی ـــ؟ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے دل کو سنبھال رہی تھیں ـــ

" بھگوان مجھے شکتی دے کہ میں یہ سمے بخوبی ٹال سکوں ـــ

اچانک ڈائس پر سے اناؤنسر کی آواز گونجی ـــ حاضرین ـــ بہنو اور بھائیو ـــ دھرم راج کی ذات کسی تعارف کی کسی پرچے کی محتاج نہیں ـــ آپ نے جو کچھ بھی کیا اس کے لئے میں ایک ہی بات کہوں گا کہ جس طرح ایک چاند دنیا بھر کی تاریکی کو دور کر سکتا ہے، کچھ ایسی ہی مثال دھرم راج جی کی بھی ہے، وہ ایک ہیں مگر انھوں نے سو ناگاؤں اور آس پاس کے گاؤں میں ایسے ایسے سماج سدھار کے کام کئے ہیں کہ لگتا ہے کہ وہ کئی ہیں ـــ (دھرم راج جی اپنی ہنسی روک نہ سکے کیونکہ یہاں پہنچ کر خود اناؤنسر نے ہی تالیاں بجانی شروع کر دیں) آج کی محفل میں بھی

وہ پن اور ثواب کا ایک بہت بڑا کام کرنے جا رہے ہیں ——— اپنے ذاتی خرچے سے لاکھوں روپے کی مالیت کا بنوایا ہوا مندر آج ان کے اپنے ہاتھوں کھلنے والا ہے ——— اس موقع پر ستیہ نارائن کی پوجا کے لئے جو پنڈت مہاراج آئے ہیں ——— وہ ابھی آپ سبھوں کے سامنے دھرم راج جی کو جنیو پہنائیں گے ——— پر اس کام کے لئے آپ میں سے کسی ایسی مہان ہستی استری کی سیوا درکار ہے جو شادی شدہ نہ ہو ——" اور عمر میں زیادہ ہو ———

لوگوں نے گردنیں بڑھا کر آگے اور پیچھے جھانکنا شروع کیا ———

اناؤنسر کی آواز پھر سے گونجی ——— "ہمارے دیش میں ابھی بدیشی ملکوں کی چھاپ نہیں پڑی ہے۔ مطلب یہ کہ بہت خوشی کی بات ہے کہ سب لوگ خوشی خوشی شادی کرتے ہیں ....

"اور بے حساب بچے پیدا کرتے ہیں ———" پیچھے سے کسی نے آواز لگائی ——— لیکن تب تک دو تین پہچان والوں نے پکڑ کھینچ کر شانتی ڈامطے کو کھڑا کر دیا تھا ———

" یہ دیوی جی غیر شادی شدہ ہیں ———"

" تو براہ کرم آپ ڈائس پر تشریف لے آیئے ———"

اناؤنسر صاحب کی آواز گونجی ——— کانپتے قدموں سے شانتی ڈامطے ڈائس پر پہونچیں تو تیز اجالے میں ان کا چہرہ دیکھ کر رائے صاحب اشوک چکرورتی اپنی جگہ بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے ———

اشلوک پڑھتے ہوئے پنڈت جی مہاراج نے بغیر کسی تکلف کے دھرم راج جی کا حلیہ اسٹرٹ کر دیا۔ پہلے ٹائی ——— پھر کوٹ ——— پھر شرٹ بھی ———

"غنیمت ہے یار پتلون رہنے دی ——" کسی منچلے نے پیچھے سے ہانک لگائی —— دھرم راج نے سخت پشیمانی اور بوکھلاہٹ کے ساتھ حاضرین کو دیکھا —— مگر بے چارے مجبور تھے ——

پھر پنڈت جی نے ایک لمبا چوڑا جنیؤ دیوی شانتی جی کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ "پہلے اسے بازو سے نکال کر گردن میں ڈالئے اور پھر ماتھے پر سیندور کے ساتھ......"

اور جب تیز روشنی میں جنیؤ اوپر نکالنے کے لئے شانتی ڈالمیا نے دھرم راج کا بازو تھاما تو وہ چاند اچانک ان کی آنکھوں کے سامنے آ گیا جو چھپا ہوا تھا تو جانے کتنوں کی زندگیوں کو تاریک کئے ہوئے تھا ——

"بیٹا —— تم —— تم —— یہ چاند ——...."

دھرم راج نے ذرا شرما کر دیوالی اور دوسری خواتین کی طرف دیکھا اور دھیمے سے لہجے میں بولے ——

"جی ہاں ماں جی یہ میرا بچپن کا پیدائشی نشان ہے ——"

جنیؤ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گرا ——

"بیٹا —— وہ بمشکل خود کو سنبھال رہی تھیں —— آج مندر کے شبہ او گمان سے شبہ اور سر پر شاید بھگوان کو بھی مجھے سرخرو کرنا تھا ——

" دھرم راج نے ذرا غور سے انھیں دیکھا —— اچانک انھیں یاد آیا ڈاکٹر جھنجھنا کر شاید ٹھیک ہی کہتا تھا کہ کچھ سر پھرا بڑھیا ہے ——"

"بیٹا تم اچھوت نہیں ہو —— اچھوت تو میں ہوں جس نے اپنے بدلے کی آگ میں جھلس کر بنا دیا۔ تم تو رائے بہادر اشوک چکرورتی کے دوسرے بیٹے ہو ——" ہانک جگہ جگہ فٹ ہونے کی وجہ سے سارے ہی آواز جا رہی تھی۔ شانتی کی بات پورا ہونے سے پہلے

اور ان کی تینی چونک کر کھڑے ہوئے۔

دھرم راج سخت سراسیمہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا ـــ کوئی بات اس کے پلّے نہیں پڑ رہی تھی۔ پھر شانتی ڈامیلے نے رک رک کر بھرے مجمع میں اشوک چکرورتی کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا ـــ

"جب تم نے میری زندگی کو کھلونا سمجھ کر دل بہلایا اور پھر توڑ پھوڑ کر پھینک دیا تو میں نے زندہ رہنے کا بہانہ ڈھونڈنے ڈاکٹری کی پڑھائی پوری کر لی ـــ ہاسپٹل تمھارے گاؤں سے دُور ہی سے کھولا، لیکن یہ بھی قسمت تھی کہ تمھاری اولاد کو میرے ہی یہاں جنم لینا تھا ـــ ایک ہریجن عورت کی پکار کہ مجھے بیٹی نہیں چاہیئے اور تمہارا دبا ہوا جذبۂ انتقام ـــ میں نے اپنے ضمیر کی آواز کو کچل کر تمہارا بیٹا ایک ہریجن عورت کی بچّی سے بدل دیا ـــ کہ جی بھر کے دُکھ بھوگے، اتنے دکھ جتنے تم نے مجھے دیئے ـــ بس بچّے کی ایک نشانی اتفاقاً میری نظر سے گذر گئی ـــ بازو پر چاند کا پدم ـــ پھر زندگی کے بھیڑ بھڑکے میں سب کھو کر رہ گئے، مگر میرا مامتا کا مارا دل اس بدنصیب بچّے کے لئے سدا روتا رہا ـــ لیکن بھگوان کے کھیل بھی نیارے ہوتے ہیں ـــ میں نے جس بچّے کو اس لئے بدل دیا تھا کہ وہ ہریجن ہو کر پلے بڑھے اور دنیا بھر کی ذلّتیں سہے، وہی بچّہ ساری ہریجن جاتی کے لئے ایک مشعلِ راہ بن گیا ـــ وہ ہریجن بچہ ـــ جو دراصل برہمن ....."

مگر اچانک دھرم راج چیخا ـــ میں برہمن نہیں ہوں ـــ میں برہمن نہیں بننا چاہتا ـــ

میں اچھوت ہوں ـــ

"میں اچھوت ہوں ـــ"

ہر طرف ایک شور ــــ ہلّڑ ــــ مچی ہوئی تھی۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ رائے اشوک چکرورتی تو اپنی جگہ ندامتوں کے ڈھیر میں ڈوبے کھڑے تھے، ان کی دھرم پتنی البتہ لوگوں کو چیرتی پھاڑتی بیٹے تک پہونچ گئی تھیں جو آج اچانک ہی انھیں پلا پلایا مل گیا تھا ــــ وہ پٹاپٹ اس کی بلائیں لئے جا رہی تھیں مگر وہ عجیب کس مپرسی کا شکار بنا کھڑا تھا ــــ

پھر سے شانتی ڈامِلے کی آواز گونجی ــــ "میں گنہگار یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتی تھی اسی لئے میں نے صرف ڈاکٹر بھٹناگر کو زندگی میں یہ راز بتایا تھا، آج میں کس منہ سے بھگوان کا شکر ادا کروں ــــ" دھرم راج نے اچانک مجمع میں سے ڈاکٹر بھٹناگر کو نکل کر تیز تیز جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ اپنے آپ میں مسکرا کر پھر سے شانتی ڈامِلے کی بات سننے لگا ــــ

"میں کس منہ سے اپنے بھگوان کا شکریہ ادا کروں کہ اس نے میرے سینے سے اس بوجھ کو اتار دیا ــــ میں خود ہی نیچ ذات کی کیچڑ میں دبی رہی، یہ دکھ اور بھی جان لیوا تھا کہ ایک برہمن بچے کو ہریجن بنا ڈالا ...."

"مگر ماں جی ــــ دھرم راج چلّایا ــــ آپ کس رشتے سے مجھے برہمن کہہ رہی ہیں۔ میری ماں جس کا میں نے دودھ پیا وہ بھی اچھوت تھی ــــ جن لوگوں میں جس خاندان میں میں پلا بڑھا وہ سب اچھوت تھے ــــ یہ رشتہ کوئی کچا دھاگا نہیں ہے جسے ایک جھٹکے سے توڑ دیا جائے ــــ سانپ ہمیشہ چندن کے پیڑ سے لپٹا رہتا ہے مگر چندن اس سے زہریلا نہیں ہو جاتا..... پھر وہ کچھ رکتے رکتے بولا۔ اور سب سے بڑی بات میری ہونے والی دلہن بھی تو میری ہی طرح اچھوت ہے ــــ اور مجھے اپنے اچھوت ہونے پر فخر ہے کیونکہ ہمیں وہ لوگ ہیں جن کا دھرتی سے اٹوٹ رشتہ ہے ......

اور جب یہ سب کہتے کہتے اُس نے گھوم کر اس جگہ نظریں دوڑائیں جہاں دیوالی بیٹھی ہوئی تھی تو وہ حیرت زدہ سا رہ گیا ـــ دیوالی پنڈال میں سے اٹھ کر دھیرے دھیرے باہر چلی جا رہی تھی ـــ

وہ اچانک، تیزی سے اس کی اُور دوڑا ـــ

"دیوالی ـــ تم اچانک چلی کیوں آئیں ـــ" اور اس نے دیوالی کا ہاتھ تھام لیا ـــ "چھوڑ دیجئے میرا ہاتھ ـــ" دیوالی غصّے سے بولی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے ـــ "مگر کیا ہوا دیوالی ـــ" میں نے کیا کیا ہے ـــ؟ وہ لجاجت سے بولا ـــ

آپ پوچھتے ہیں آپ نے کیا کیا ہے؟ میں کہتی ہوں آپ نے کیا نہیں کیا ہے ـــ ـــــــ ہر بار ایک سے ایک نیا ڈھونگ رچاتے رہے۔ کبھی برہمن بن جاتے کبھی اچھوت ـــ اور جب میں نے اپنے آپ کو آپ سے وابستہ کر دیا اور ایک سرپھری اور پاگل ندی کی طرح آپ کی ذات کے سمندر میں خود کو ملا دینے کا عہد کر لیا تو ..... وہ اچانک زور زور سے رونے لگی ـــ

"میں بھول گئی تھی کہ آپ کے دل تک جو راستہ جاتا ہے وہ سونے چاندی کی اینٹوں سے بنا ہوا ہے اور میں دھول اور مٹی پر چلنے والی .....

دھرم راج نے اس کے ہونٹوں پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "بس ـــ بس ـــ کرو۔ بھگوان کے لئے ایسی باتیں مت کرو ـــ" ہم سب ـــ تم بھی ـــ میں بھی اُن لوگوں میں سے ہیں جو دکھوں کی کھیتی بوتے ہیں اور آنسوؤں کی فصل کاٹتے ہیں ـــ میں تم سے الگ کہاں ہوا دیوالی ـــ تم چلی گئیں تو میری زندگی میں ایسا اندھیرا چھا جائیگا کہ دنیا کے سارے چراغ مل کر بھی ہلکا سا اُجالا تک پیدا نہ کر پائیں گے ـــ"

دیوالی نے غصّہ سے اُسے دیکھا ۔" اتنے بڑے گاؤں کے ٹھاکر اور مالک کے لئے دیوالیوں کی کیا کمی ۔"؟

" دیوالی ۔" دھرم راج جذبات کی شدّت سے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پیتا ہوا بولا ۔" مت اتنی ظالم بنو ۔

" ظالم میں نہیں ۔ آپ ہیں ۔ جب آپکو پتہ تھا کہ آپ کون ہیں کیا ہیں تو اتنا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی ۔ ٹھاکر صاحب آپ زمیندار کے بیٹے ہیں اور بیٹے رہیں گے ۔ اور میں ....."

دھرم راج نے غصّہ سے اس کی بات کاٹی ۔" دیوالی میں تم سے کہہ رہا ہوں مجھے یہ ساری باتیں واقعی نہیں معلوم تھیں ۔"

اب تو معلوم ہو گئیں ۔ اور جب اپنے نئے ماحول میں آپ رچ بس جائیں گے تو وہی ہو جائیں گے جو سبھی ہوتے ہیں ۔ اور یہ بڑی بڑی باتیں دھری کی دھری رہ جائیں گی ۔ اک دم وہ غصّہ سے گھوم گئی ۔" یہ تو کہئے قسمت کی بات تھی جو آپ اچھوتوں کے بیچ پل کر بڑے ہوئے اور ان کے دکھ درد کو محسوس کیا ۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو ....." دھرم راج نے ایک غم زدہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا ہاتھ تھام لیا ۔

" یہی تو میں کہتا ہوں دیوالی ۔ دانہ جب تک مٹی سے نہیں مل جاتا یونہی پڑا رہتا ہے ۔ اور جب مل جاتا ہے تو پھول بن کر اٹھتا ہے ۔ کھیتی بن کر لہراتا ہے، بہار بن کر جھومتا ہے ۔ ساری بات رشتہ داری کی ہے ۔ میں اپنا رشتہ خوب سمجھ گیا ہوں ۔" وہ کچھ آگے بڑھا ۔" اور اس پر بھی تمہیں اس مٹی سے میری وفاداری کا یقین نہیں آتا تو ایک لمحے کے لئے میری آنکھیں دیکھ لو ۔ تمہیں بھی

جھوٹ نہیں بولتیں ـــ اور میری ماں تو بڑی ہی سچی تھی، وہ کہتی تھی پاپ اور جھوٹ آنکھوں میں اُتر جائیں تو انسان کبھی کسی سے آنکھ نہیں ملا سکتا ـــ"

دیوالی نے دھیرے دھیرے آنکھیں اٹھائیں اور دھرم راج کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں بٹھا دیں ـــ دھرم راج کی آنکھیں، جو اتنی معصوم، اتنی شفاف اتنی محبت بھری تھیں کہ کوئی جھوٹ اُن میں سما ہی نہ سکتا تھا ـــ ؟

" پوجا کا سمے ہو گیا ـــ مندر میں نہیں چلو گی ـــ" ؟ دھرم راج دھیرے سے بولا ـــ!

"میرے ساتھ ـــ" !

اور سینکڑوں ہزاروں لاتعداد اچھوتوں اور نیچ جاتی کے لوگوں کے ساتھ جب دیوالی کا ہاتھ تھامے وہ مندر میں داخل ہو گیا اور اس کے نقشِ قدم پر چلتے چلتے اس کے اپنے ماں باپ بھائی بہن سبھی اندر پہنچ گئے تو بابا نے کھڑے کھڑے پیار سے سوچا ـــ

" جب بھی ظلم اور ناانصافی کی گھور تاریکی چھائی ہے، تم ہی جیسا کوئی جیالا مشعل لے کر اُٹھا ہے ـــ"

اندر زور زور سے گھنٹیاں بجنے لگی تھیں ـــ

پگھلتی آگ

"اے جی" ذرا میری چولی کے ٹنک تو لگا دیجیے!"

"م..... مم..... میں.....؟" ایک مردانی آواز —

آواز میں گھبراہٹ — کچھ خجالت — کچھ شرم۔

"پھر وہی نسوانی کھنکھناتی نخرے بھری آواز — "اوہو! کھولتے ہوئے شرم نہ آئی۔ ہاں، تم ہی نے تو کھولے تھے — اب، کہہ دو نا میں نے تمھیں ہاتھ جو لگایا ہو — ہنہ، پھر میری یہ درگت کس نے بنائی؟ ساڑھی اِدھر — چولی اُدھر....."

اور کچھ یوں دھینگا مُشتی، جیسے کوئی مرد بغیر مونہہ سے آواز نکالے اٹھا ہو کہ کسی عورت کو بانہوں میں دبوچا ہو — اور کپڑوں کی سرسراہٹ.......

اور یہ سب کچھ عین بڑی بیگم کے کمرے کے برابر ہو رہا تھا۔ صرف ایک دیوار ہی کی تو آڑ تھی اور دیوار بھی کم بخت اینٹ، سیمنٹ، پتھر، چونے ہی کی تھی، کوئی لوہے کی تو نہ تھی کہ اُدھر کچھ ہو تو اِدھر سنائی ہی نہ دے — کیا آنکھوں سے چھپتا ہی سب کچھ ہے؟ اُدھر چھپا تھی — وہی ہندو دھوبن، جس نے حویلی کے میلے کپڑے دھوتے دھوتے اب ان کی قسمت بھی دھو کر رکھ دی تھی۔ اور مرد؟ ان ہی کے اپنے میاں — بڑے سرکار۔ بڑے سرکار ایسے کوئی بڑے پارسا بھی نہیں کہ جن سے جھجک اور بہک جانے کا بڑی بیگم

ملال لے کر بیٹھ جاتیں۔ وہاں تو ساری زندگی ان ہی رنگ رلیوں میں گزری تھی۔ مشہور تھا کہ جیسے ہی رات چڑھتی اور نوکرانیوں کی فوج باورچی خانے سے ملے ہوئے بڑے برآمدے میں سوتی۔ بڑے سرکار اپنے دو چار حوالیوں موالیوں کے ساتھ ٹارچ لے کر نکلتے۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک سوئی ہوئی قیاستوں کے چہروں پر ٹارچ چمکاتے جاتے، جو عورت سب سے زیادہ بھاجاتی ٹارچ کی روشنی وہاں زیادہ دیر تک کلبلاتی رہتی۔ پھر وہ اپنے محل نما کمرے کو پلٹ آتے اور تھوڑی ہی دیر میں وہ تحفہ سجا کر بنا کر ان کی خوابگاہ میں پہنچا دیا جاتا ـــــ اللہ جانے اس کارروائی کی شریک بڑی بیگم بھی تھیں یا جان کر طرح دے جاتی تھیں۔ مگر یہ بات طے تھی کہ وہ اس حقیقت کو قبول کر چکی تھیں کہ مرد چکنا چرتا ہی مرد لگتا ہے۔ اور پھر ان کی خوابگاہ کو رونق بخشنے والیاں تھیں بھی کون۔ یہی ان کی پالی پوسی مسلمان چھوکریاں۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وہ نوکرانیاں بس بڑے سرکار کی رات بھر کی ہی سنگی ساتھی ہوتی تھیں۔ صبح اٹھ کر جس طرح وہ رات کے میلے کپڑے اتار دیتے تھے ویسے ہی اپنی ایک رات کی دلہن کو بھی نظر سے اتار دیتے تھے۔ نہ کبھی کسی پر ایسا دل آیا کہ گلے کا ہار بنا کر ڈال لیا ہو۔ نہ کبھی دوسری شادی کے بارے میں سوچا تک بھی ـــــ پھر بڑی بیگم اعتراض بھی کیا کرتیں؟ اور وہ یوں بھی ایسے دبدبے اور وقار والی خاتون تھیں کہ انھیں بار بار مرد کے پاس جانا بھی، چاہے وہ اپنا شوہر ہی ہو، اپنی عزت اور شان کے خلاف ہی محسوس ہوتا تھا۔ ایسے میں انھیں تو بلکہ ایک طرح کی چھوٹ سی ملی ہوئی تھی، جس کی وہ عادی بھی ہو چلی تھیں، لیکن اس بار تو حد ہی ہو گئی۔ انھیں ایسا لگا کہ گویا ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سلب ہو کر رہ گئی ہو ـــــ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ بڑے سرکار کا دل کبھی اس طرح ڈولے گا کہ کسی ہندو عورت پر آجائے گا

اور آئے گا تو یوں آئے گا کہ وہ اسی میں گم ہو کر رہ جائیں گے۔

بڑی بیگم اور چمپا کا کبھی آمنا سامنا نہ ہوا تھا۔ حالانکہ وہ اسی حویلی کے باہری کوارٹروں میں سے ایک میں رہتی تھی جو نوکروں کے لئے بنے ہوئے تھے۔ بھانت بھانت کے، ذات ذات کے نوکر ٹھنسے پڑے تھے۔ ایک چمپا نا اصل کی کیا تخصیص تھی جو بڑی بیگم اس کے درشن کرنا چاہتیں ــــ ویسے بھی وہ بڑی مذہبی اور رکھ رکھاؤ والی بی بی تھیں ــــ اپنے نماز روزے، عبادت میں گم رہنے والی ــــ ان کے مسلمان نوکرانی ہی دھوتی تھی۔ ان کی خود ساختہ پاکیزگی کا تصور اتنا شدید تھا کہ وہ خاندان والوں کی نگاہوں میں نکو بن کر رہ گئی تھیں۔ کوئی بے وضو ان کے حمام کے نل سے پانی نہیں لے سکتا تھا۔ برق کے مریض کی طرح انھوں نے اپنی ہر چیز ــــ کھانے کے برتن سے لے کر فرنیچر تک ــــ الگ کر رکھی تھی۔ بڑے سرکار اس پاکی اور پلیدی کی کٹ کٹ سے کبھی تو سخت عاجز آجاتے اور کبھی ہنس کر کہہ اٹھتے "بخدا یہ محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے کسی عورت سے نہیں کسی مسجد سے شادی کر رکھی ہے۔"

کم بخت بات سے بات نکلی چلی آتی ہے، اصل بات تو یہی تھی کہ بڑی بیگم کی اس پاکی اور عبادت کے چکر نے ہی بڑے سرکار کو ان سے دور کیا ــــ ورنہ بڑی بیگم قیامت تھیں، قیامت، وہ روپ وہ رنگ وہ کشش کہ انسان نظر بھر کر دیکھنے کی جرأت تک نہ کر سکے۔ مگر جہاں کبھی میاں کا دل آیا اور انھوں نے ہاتھ پکڑا، یہ اپنے آپ میں سمٹیں ــــ "لے ہٹئے بھی ــــ مجھے نماز کو جانا ہے ــــ" کبھی وقت بے وقت تمتمائے گال دیکھ کر انھوں نے اپنے ہونٹ بڑھائے کہ یہ چلائیں ــــ "ہٹئے بھی ــــ میں نے مغرب کے وقت دعائے گنج العرش آدھی ہی پڑھی تھی۔ پوری کرنی ہے اور عشا کا وقت بھی سر پر آگیا ہے۔"

مرد آخر مرد ہی ہوتا ہے — کب تک طرح دے! اللہ میاں نے مرد کی فطرت بھی عجیب بنائی ہے۔ شریف بیوی میں بھی وہ تھوڑی سی چٹک مٹک اور چنچل بھر طوائف پن کا آرزو مند ہوتا ہے۔ جس کا ہاتھ کھینچا جائے تو وہ ادا کے ساتھ جھٹک دے۔ قریب کرے تو کسمسا کر نکل جائے ایک ایسا انداز جو بچ نکلنے کے باوجود خود سپردگی کا کھلا اعلان ہو — بڑی بیگم میں ایسی کوئی ادا نہ تھی۔ نہ تو اللہ معلوم مارے باندھے کا ایک لڑکا ہی کیسے ہو گیا۔ ایسے میں نہ انھیں میاں کے بھٹکنے کا غم تھا، نہ کبھی جلن ہی دل میں محسوس کی — لیکن یہ سن کر کہ اب کی بار میاں کا دل ایک ہندو عورت پر آیا ہے، اُن کا مذہبی تن کر تلوار بن گیا — اب کوئی ان سے پوچھے کہ بھئی عورت ہندو کہاں سے ہوتی ہے اور مسلمان کہاں سے؟ عورت عورت سب برابر ہے۔ مگر یہ احساس کہ ان کے اپنے شوہر نے کسی غیر مذہب کی عورت کو چھوا ہے۔ ان کو جلا کر خاک کر گیا۔ انھوں نے طے کر لیا کہ اب وہ ہاتھ کبھی ان کے جسم کو نہ چھو سکیں گے۔ جنھوں نے کسی غیر مذہب والی عورت کو چھو لیا ہے —

کیسی عجیب بات تھی کہ وہ عورت جس نے اپنے میاں کی رنگ رلیوں کو سدا اس نظر سے دیکھا ہو جیسے کوئی بچہ رنگ برنگے کھلونوں سے کھیلتا ہے۔ اب سوتیا ڈاہ کی آگ میں بھنی جا رہی تھی۔ دیوار آڑے ان کی چھاتی پر مونگ چھوڑ گیہوں دلتے، اُڑد سب دلے جاتے، مگر وہ کچھ نہ کر پاتیں۔ ان کا اپنا کمرہ میاں کی خوابگاہ سے بالکل ملا ہوا تھا۔ میاں کی خوابگاہ، جو پہلے ان دونوں کی اپنی مشترکہ خواب گاہ تھی اسی کے ساتھ والا کمرہ شروع سے انھوں نے اپنی آسانی کے لئے نماز روزے عبادت کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ بیچ میں دروازہ بھی تھا کہ دور سے پھیر لگا کر آنے جانے میں تکلیف نہ ہو۔ بیچ کی دیوار چھت کے پاس سے دو دو بالشت کھلی ہوئی تھی کہ

ادھر کوئی سانس بھی لے تو ادھر سنائی دے جائے۔ اب جب موٹی سانس جیسی چیز سائرن بن کر سنائی دیتی ہو تو ایسی دھینگا مشتی اور رنگ برنگے بولوں کا کیا ٹھکانا تھا جو خود ہی بغیر کسی پردہ داری کے جان بوجھ کر علی الاعلان کیے جاتے ہوں! اور بڑی بیگم کو یہ بھرپور یقین تھا کہ وہ کم بخت نا اصل چمپا جان بوجھ کر، انھیں جلانے کو یہ سب تمہے کرتی ہے۔ ان کا بس چلتا اور کہیں اسے دیکھ پاتیں تو شاید زندہ جلوا دیتیں، بھون کھاتیں ـــــ لیکن کیسی عجیب بات تھی کہ محض دیوار کی آڑ اس کا بسیرا تھا اور کبھی جھلک تک نہ دکھائی دی ـــــ بس آواز ہی آواز تھی، جس نے ان کے پورے وجود کو کان بنا کر رکھ دیا تھا۔

لیکن ایک دن ـــــ ایک دن گرمی کے بھپاروں سے بولا کر بڑی بیگم جب موانے باغ میں نکلی چلی آئیں جہاں سنتروں اور آم کے ٹھنڈے ٹھنڈے بے پناہ کنج تھے۔ اور بیچ میں لہر لہر کرتا ٹھنڈے پانی کا حوض تھا، تو اچانک انھیں ایک ایسا منظر نظر آیا کہ وہ اپنی جگہ سناٹا کر رہ گئیں ـــــ بڑی بیگم کو اگر گرمی ستا سکتی تھی تو وہ تو تھی ہی ذات کی دھوبن ـــــ سدا پانی میں رہنے والی مچھلی۔ اسے بھی تو ٹھنڈک کی ضرورت تھی ـــــ اور ٹھنڈک اور تراوٹ حاصل کرنے اگر کوئی عورت محض آنگ کے کپڑوں سے حوض میں کود پڑے تو یہ کوئی جرم تو نہیں؟ اُس نے نہاتے نہاتے گھوم کر پیچھے دیکھا تو بڑی بیگم ـــــ کہ سرتاپا عورت تھیں ـــــ چکرا کر رہ گئیں۔ کیا دہکتی دہکتی جوانی تھی! انھیں لگا کر اگر وہ اس حوض میں ہاتھ ڈال کر دیکھیں تو یقیناً اُس کے جوان جسم کی حدت سے وہ ٹھنڈا پانی گرم ہو گیا ہو گا۔ ایسی جوانی کہ کسی کے جسم سے انگلی بھی چھوا دے تو وہیں آبلہ پڑ جائے اور پھر اُس کی قیامت خیز ہنسی ـــــ جو ہونٹوں کے گوشوں سے بکھر کر سارے چہرے کو منور کر گئی تھی۔ ایک دم بڑی بیگم

کو احساس ہوا کہ بھیگی ہوئی عورت سراپا دعوتِ گناہ ہوتی ہے۔ ممکن ہے بڑے سرکار نے اس دہکتی آگ کو پہلی بار اسی روپ میں دیکھا ہو ــــ اس وقت کیا وہ اپنا دامن بچا سکتے تھے۔ سانولے بدن سے نکلتے یہ شرارے ــــ اور قیامت کا چلبلاپن ــــ اور اس کی وہ جان لیوا ادائیں اور باتیں، جو وہ رات دن دیوار کی آڑ سے نہ چاہتے ہوئے بھی سنتی رہتی تھیں! بڑے سرکار میں کیا دم اور حوصلہ تھا کہ ایسی تلوار کی کاٹ سے محفوظ رکھ سکتے؟ جب ہی تو وہ دیکھ رہی تھیں کہ بڑے سرکار جو ہر جوانی کے بس رات بھر کے ساتھی رہتے تھے، اب اس کا پلّو بھی نہ چھوڑتے کہ عجب یکیلے ڈکیلے جوتیاں بھی چاٹتے ہوں! اب جب کہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی تباہی کے سامان دیکھ چکی تھیں، کسی صورت اس حویلی، اس ماحول میں گزارہ نہیں کر سکتی تھیں انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ فوراً ہمیشہ کے لئے گاؤں چلی جائیں گی۔ اللہ کا دیا وہاں سب کچھ تھا ــــ گھر کی کھیتی باڑی، باغ بغیچے بھرپور آمدنی، یہاں بھی دن رات عبادت کرتی تھیں، وہاں بھی کریں گی ــــ لیکن یہ روز روز کے تماشے تو اپنی آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا نہ کریں گی ــــ وہاں کم سے کم اپنا خالص مذہبی اسلامی ماحول ملے گا۔ یہ تو نہ ہوگا کہ میاں نے ابھی ابھی جن ہاتھوں سے کسی ہندو دھوبن کے جسم کو سہلایا، جن ہونٹوں سے کسی غیر مذہب والی کے بوسے لیے اسی حال گُھلے سے ان کے کمرے میں چلے آ رہے ہیں اور انھیں بھی چھو رہے ہیں۔ ٹھیک ہے مذہب کے ناطے وہ گنہگار ٹھہریں گی، کیونکہ اللہ میاں نے شوہروں کے بڑے حقوق رکھے ہیں۔ عورت ذات پر شوہر کی خدمت کی بڑی ذمہ داریاں رکھی ہیں، لیکن جب اپنا دل ہی خوش نہ ہو تو کاہے کی جنّت اور کاہے کی دوزخ۔ ایسی جنت کو لیکر کوئی کیا چاٹے، جب خود اپنے دل میں دوزخ کی سی آگ بھڑک رہی ہو

بڑے سرکار کی اماں گاؤں ہی میں رہتی تھیں۔ کتنی ہی بار انھوں نے بہو بیگم کو بلوا بلوا بھیجا تھا کہ کبھی آئیں، مہینہ دو مہینہ رہیں، گاؤں کی بہار، کھیتی باڑی، میلے ٹھیلے دیکھیں لیکن وہ کبھی شہر سے ہلیں بھی نہیں۔ اب جو بہو بیگم لونڈیوں، باندیوں کی فوج کے ساتھ مستقل قیام کے ارادے سے پہنچیں تو اماں بیگم کے پوپلے منہ سے ہنسی جدا نہ ہوتی تھی ــــ

گاؤں والوں کے لئے بہو بیگم کی آمد ایک جشن سے کم نہ تھی۔ اُن کے پہونچتے ہی ٹولیاں بنا بنا کر مرد، عورتیں، بچے، نذرانے حسب حیثیت تحفے لے لے کر صدقہ اتارنے پہنچنے لگے۔ مرد تو وہیں غلام گردش سے واپس پھیر دیئے جاتے کہ بڑی بیگم پردے کی سخت پابند تھیں۔ البتہ عورتیں اور بچے ان کے درشن کرنے کی سعادت حاصل کر رہے تھے۔

سرخ کنارے والی نیلی دھوتی، ناک میں نتھنی اور پیٹ پیٹھ دکھاتا بلاؤز پہنے جب ایک البیلی سی عورت تیل کا تھال لئے بڑی بیگم کے پاس پہنچی تو انہوں نے ایک اندیشے کے ساتھ اپنے پاؤں سکیڑ لئے، اور اپنے ساتھ والی نصیبن سے پوچھا "یہ تو مجھے کوئی ہندو سی معلوم ہوتی ہے۔"

یہ بظاہر بے ضرر سا جملہ تھا۔ مگر آنے والی کے دل کو تیر کی طرح چھید گیا۔ اس نے بے بسی سے سر اٹھا کر انھیں دیکھا تو ماتھے پر ایک بندیا بھی انھیں چمکتی نظر آگئی۔ وہ اور بھی سمٹ کر بولیں۔ "نا بابا ــــ تم ہندو ہو میں گنہ گاری میں نہیں پڑنا چاہتی۔"

بندیا والی کی ساتھ والیوں نے ایک دوسرے کو گھبرا گھبرا کر دیکھنا شروع کیا کہ بڑی بیگم بغیر کسی شرمساری یا ندامت کے، وہاں سے اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ جاتے جاتے اپنی خاص کنیز کو ہدایت کرتی گئیں۔ "میرے وضو کے لئے پانی تیار کرا دے ــــ ... کم بخت نے مجھے چھو لیا، مجھے پلید کر دیا۔"

یہ گاؤں، اماں بیگم کا گاؤں تھا، جہاں شروع گھڑی سے آج کے دن تک انہوں نے

پیار کے بیج بوتے تھے ـــــ ہر ذات ہر بھانت کے لوگوں کی یہ بستی تھی۔ کیا چمار کیا دھیڑ کیا پنج کیا اونچ ـــــ وہ سب لوگوں کی اماں بیگم تھیں۔ دیوالی پر ہندو عورتیں مٹی کی سکوریوں میں چراغ جلا کر آتیں اور حویلی کی منڈیریں سجا کر جاتیں ـــــ ہولی پر پچکاریاں بھر بھر کر رنگ لاتیں اور نمازی اماں بیگم کے سفید کپڑوں کو باغ و بہار کر جاتیں۔ راکھی پر حویلی کے مردوں کو ہندو عورتیں راکھی باندھتیں۔ خود اماں بیگم کے ماتھے پر جہاں نمازوں نے ایک چمک دار گٹہ بٹھا دیا تھا۔ رنگین بندیا لگا کر جاتیں۔ عید بقرعید، شب برات پر بھی غیر مذہب کے لوگ حویلی میں آ کر میٹھا، شیر خورمہ، سویاں، کباب، حلوے کھا کر جاتے۔ اماں بیگم نے گاؤں بھر میں محبت اور پیار کی وہ فضا قائم کر رکھی کہ لگتا تھا سب ایک ہی ماں کے پیٹ کی اولاد ہیں ـــــ وہ کہا کرتیں "زمین اور عورت ایک ہی روپ کے دو نام ہیں۔ زمین سب کو اناج دیتی ہے، پیار دیتی ہے، زندگی دیتی ہے ـــــ یہی حال عورت کا ہے جو صرف محبت بانٹنا جانتی ہے۔ یہ سب لوگ میرے بچے ہیں۔ میں انھیں پیار نہ دوں تو کون دے۔ اماں گاؤں والوں کے لئے ایک دیوی کا درجہ رکھتی تھیں ـــــ اب اُن کے بڑھاپے کے دن تھے۔ کمر جھک گئی تھی۔ اعضا جواب دے رہے تھے۔ سرسوں کی طرح جلے جیسا اور دھوپ کی طرح اُجلا ہو گیا تھا۔ آنکھیں ایک زمانے کا سرد و گرم دیکھتے دیکھتے دھندلا چکی تھیں ـــــ ان کے ایسے چل چلاؤ کے وقت میں سب گاؤں والوں کو، جہاں کی بیشتر آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ بہو بیگم کی آمد کی خبر ملی تو وہ اپنی جگہ پھول کی مانند کھل اُٹھے کہ چلو حویلی نئے سرے سے آباد ہو جائے گی۔ پیار محبت کی وہ جڑیں جو اس حویلی میں پیوست ہیں، نئے سرے سے مضبوط ہو جائیں گی ـــــ لیکن بہو بیگم نے آتے ہی وہ ہاتھ جھٹکا کہ لوگوں کے دل مرجھا کر رہ گئے ـــــ یہاں سے وہاں تک سب ہی لوگوں میں چاؤں چاؤ

ہوگئی کہ بہو بیگم نے لیلاوتی کا مذمانہ ٹھکرادیا۔ مگر گاؤں کے بڑے بوڑھے جو ہمیشہ سے حویلی والوں کے خون کی جگہ پسینہ گرانے کو تیار رہے تھے۔ جنھوں نے اس حویلی کا برسوں نمک کھایا تھا، اس ہلکے سے وار سے زیر نہ ہو پائے۔ جوانوں کو انہوں نے یہ کہہ کر سمجھا بجھا دیا "بہو بیگم نئی نئی گاؤں آئی ہیں۔ شہر کی عادتیں پڑی ہوئی ہیں۔ ہوتے ہوتے ہم میں گھل مل جائیں گی۔"

مگر بڑی بیگم جو اپنے گھر کو چھوڑ پردیسی ہوگئی تھیں، اس حقیقت کو کبھی نہ بھول سکیں کہ انھیں جلاوطن کرنے والی ایک ہندو عورت تھی، جس نے ان کے سر کا تاج آنکھوں دیکھتے اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا تھا۔ وہ کیسے اس ذات کو معاف کر دیتیں؟ نفرت کا بیج اپنی جڑیں گہری کرتا گیا اور ایک تناور درخت میں بدلتا گیا۔

گاؤں پہونچنے کے چند دن بعد جب ہولی کا رنگین تہوار آیا تو بڑی بیگم اپنے کمرے کی کھڑکی سے سارا تماشا دیکھتی رہیں کہ رات سے کس طرح ہولی چلنا شروع ہوئی۔ کس طرح لوگوں نے جھوم جھوم کر گا گا کر اپنے جذبات کا اظہار کیا —— پھر صبح وہ نماز اور قرآن شریف کی تلاوت سے فارغ ہوکر بیٹھی ہی تھیں کہ بڑے دروازے پر دھوم دھڑکا شروع ہوا اور اُن کے آنکھوں دیکھتے ہلتی کا نپتی اماں بیگم برآمدے والے بڑے تخت پر آکر بیٹھیں۔ عورتوں، مردوں نے آگے بڑھ کر ان کے ماتھے کو داغ دار کیا اور کپاس جیسے سفید کپڑوں پر ہر رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ بکھیر اگیا۔ بڑی بیگم نے تھرّا کر یہ سب دیکھا۔

" یہ اماں بیگم کو ہو کیا گیا ہے؟ دیکھنا سیدھی دوزخ میں جائیں گی۔"

انہوں نے خود کو سنایا اور جھپک کے خود ہی دھڑ سے دروازہ بند کرلیا۔

ابھی انہوں نے تسبیح پر وظیفے کا ایک دور بھی پورا نہ کیا ہوگا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

انہوں نے 'اللہ اللہ' اللہ اکبر' کا ورد کرتے ہوئے جاکر دروازہ کھولا تو رنگوں میں ڈوبی گڑیا بنی آماں بیگم پوپلے منہ سے ہنس کر پوچھ رہی تھیں۔ "اوئی بٹیا، گاؤں والے تمہارے سہاگ کی خیر منانے آتے ہیں۔ بندیا نہ لگاؤ گی؟"

اُن کا جی چاہا کہ چلا کر کہہ دیں "یہ سہاگ، راگ رنگ اور بندیا آپ ہی کو مبارک ہو" مگر وہ ضبط کر گئیں۔ سینے پر پھونک مار کر تسبیح کیل پر ٹانگتے ہوئے بولیں۔ "آماں بیگم آپ کافر بن گئی ہیں تو بن جائیے۔ مگر خدا کے لئے مجھے کانٹوں پہ نہ گھسیٹئے۔"

آماں بی کا منہ اتر گیا۔ انہوں نے بڑے دکھے دل کے ساتھ بہو کو دیکھا۔ تھوڑی دیر یوں ہی کھڑی رہیں، جیسے سوچتی ہوں کیا کہوں کیا نہ کہوں۔ پھر جیسے بڑی مشکل سے بولیں۔ "بٹیا کوئی کافر ہے نہ مومن سب ایک ہی ہستی کو پوجتے ہیں۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔" بٹیا، سب انسان ایک ہیں۔ سب کے دل ایک ہیں۔ سب کا پالن ہار ایک ہی ہے.....

"آماں بیگم، میں تقریر سننے کے موقف میں نہیں ہوں" انھوں نے جھلا کر کہا اور دروازہ بند کر لیا۔ کیوں کہ باہر آنگن مردوں سے پٹا پڑا تھا اور انھیں بے پردگی کا ڈر تھا۔

رفتہ رفتہ بہو بیگم کی گرفت حویلی پر پکی ہو رہی تھی۔ اور اس دن مولوی صاحب کو برطرف کر کے گویا انہوں نے پہلی بار اپنے پوری طرح برسر اقتدار آنے کا ثبوت دیا تھا۔

مولوی صاحب اس حویلی میں مدتوں سے بچوں کو عربی، اردو، قرآن شریف پڑھانے پر مامور تھے۔ اس دن پڑھائی کے کمرے سے الگ کر ایک کرسی ڈلوا کر بڑی بیگم تسبیح رول رہی تھیں، یہ بھی سوچا تھا کہ سنوں تو سہی مولوی صاحب کے پڑھانے کا انداز کیسا ہے، اندر سے مولوی صاحب کی آواز آ رہی تھی۔ "بچو، رابعہ بصری جو

عبادت کرتے کرتے ایک مجذوبہ کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں، جذب اور کشف کی انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ ان ہی رابعہ بصری کو ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ ایک ہاتھ میں آگ اور دوسرے ہاتھ میں آگ اور دوسرے ہاتھ میں پانی لئے دوڑتی چلی جاتی ہیں لوگوں نے انھیں روک کر پوچھا۔ "اے بی بی آپ کہاں دوڑی جاتی ہیں اور اس آگ اور اس پانی کا مطلب کیا ہے؟" تو ان بی بی نے جواب دیا۔ "میں اس آگ سے جنّت کو جلا دوں گی اور اس پانی سے دوزخ کو ٹھنڈا کر دوں گی تاکہ لوگ محض جنّت کے لالچ یا دوزخ کے ڈر سے عبادت نہ کریں ـــــ ارے عبادت خدا کی خوشنودی کے لئے کرو۔ عبادت اس لئے کرو کہ خدا تم سے خوش رہے اور جب خدا خوش رہے گا تو نزل آسان ہے! بچّو خدا کو خوش کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کی مخلوق سے۔ اُس کے بندوں سے پیار کرو۔ مذہب، ذات پات کے خیالات کو دل میں لائے بغیر پیار کرو۔ ہمارے حضورؐ نے کہا ہے: بچّو کہ تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کو خوش رکھے ـــــ یہ سوچے بغیر کہ پڑوسی کا مذہب کیا ہے....."

بہو بیگم نے پردے کی آڑ سے یہ سب کچھ سُنا اور فوراً نصیبن کو بھیجا کر دیوار کی آڑ سے مولوی صاحب کو بلا بھیجا۔ "آج کے وعظ سے آپ کا کیا مطلب تھا مولوی صاحب؟"

"جی۔ جی۔" مولوی صاحب نے ہاتھ ملتے ہوئے انکسار بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "جی وہی جو ہونا چاہئے تھا۔"

"صاف صاف کہئے، آپ کا مطلب تھا کیا؟"

"جی بیگم صاحبہ ـــــ آماں بیگم کی برسوں سے یہ تاکید ہے کہ پڑھائی میں مؤثر طریقہ ہے

بچوں کو سمجھایا جائے کہ دراصل سب مذہب قابل احترام ہیں اور دوسرے یہ کہ مذہب کا بھید بھاؤ اور اونچ نیچ اصل میں کوئی چیز نہیں ہے۔ اور ....

"اور۔ اور۔ اور۔ میں سب سمجھ گئی۔ آپ کا مطلب یہی تھا تاکہ بچّوں کے دماغ میں یہ ٹھونسا جائے کہ تمہارے پڑوسی جو ہندو ہیں، قابلِ محبت ہیں — اُن سے پیار کرو؟"

مولوی صاحب چُپ!

"آپ یہی چاہتے ہیں نا کہ وہ اپنے مذہب کو چھوڑ کر ماتھوں پر تلک لگوائیں اور تہواروں پر دوزخ کی آگ کی طرح سُرخ رنگوں سے اپنے کپڑے رنگوائیں؟"

مولوی صاحب خاموش!

"میں نئی نسل کے ذہنوں میں ایسے غلط جراثیم نہیں پلنے دوں گی۔ کل سے آپ کی چھٹی۔"

مولوی صاحب آنکھوں میں آنسو بھرے امّاں بیگم سے کہہ رہے تھے۔ "امّاں بیگم میں نے بچوں کو کوئی غلط تعلیم نہیں دی۔ اللہ جانتا ہے، میں نے آج تک بچّوں کے ذہن میں وہی کچھ ڈالا ہے جس کا خود خدا اور رسولؐ نے حکم دیا ہے —"

امّاں نے غم اور آنسو بھری نظروں سے ان مولوی صاحب کو دیکھا جن کی ہڈیاں یہاں کے بچّوں کو پڑھاتے پڑھاتے جُھک گئی تھیں۔ انہوں نے برداشت اور ضبط کے بے پناہ مظاہرے کے ساتھ بس اتنا ہی کہا: مولوی صاحب تنخواہ کی کوئی بات نہیں، وہ آپ کے گھر حسبِ دستور پہنچ جایا کرے گی لیکن آپ کی عبادتوں کا واسطہ — ایک ہی عرض آپ سے کرتی ہوں آپ خدا سے دعا مانگئے کہ بہو بیگم کی آنکھیں کھل جائیں اُس کا سویا ذہن بیدار ہو جائے۔"

بہو بیگم کی آمد کے چار ماہ بعد امّاں بیگم اِس دنیا سے سدھار گئیں۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے ہی رہ گئے۔ مگر بہو بیگم نے کسی غیر مذہب کے مرد عورت کو اجازت نہ دی کہ

وہ آماں بیگم کا آخری دیدار کر سکے۔

" وہ زندگی میں جو کچھ کرتی رہیں۔ اس کی ذمہ دار وہ خود تھیں لیکن مرنے کے بعد وہ میری ذمہ داری میں ہیں۔ میں میت کی بے حرمتی نہیں ہونے دوں گی۔"

ایک لازوال مسکراہٹ اور نورانی دمک چہرے پر لئے آماں بیگم زمین کی پنہائیوں میں جا سوئیں۔ بڑی بیگم نے سنا تھا، خدا کے احکام سے دور جانے والوں کے چہرے مرے بعد سخت منحوس اور پھٹکار پڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر آماں بیگم کا چہرہ کیسے چودھویں کے چاند کی طرح دمک رہا تھا!

آماں، بی جیسے گاؤں کی رونق اور برکت اپنے وجود میں سموئے ہوئے تھیں۔ اُن کے مرتے ہی گاؤں میں وہ کال پڑا کہ بس۔ اس سال بارش ہی نہ ہوئی۔ کالے کالے بادل چھائے ضرور مگر ترسا ترسا کر یوں ہی اوپر ہی اوپر نکل جاتے۔ کتنے ہی لوگ کھیتی باڑی سے مایوس ہو کر شہروں کی طرف نکل گئے۔ اوپری بارش سے مایوس ہو کر گاؤں والوں نے محض سبزیاں ترکاریاں اگانے اور چھوٹے چھوٹے کھیت گوڑنے کی تجویز بنائی۔ اس کے لئے پانی کا بندوبست کرنے کے لئے گاؤں میں کوئیں کھودنے کی اسکیم طے ہوئی۔

پہلا کنواں بڑی بیگم نے احاطے میں کھدوایا۔ نرم زمین تھی۔ بیس بائیس ہاتھ نیچے تک ہی کھدائی ہوئی ہوگی کہ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی نے اپنا چہرہ جھلکایا۔ ایک مزدور نے لگچا پانی چلو میں لے کر مونہہ میں ڈالا اور خوشی سے بولا میٹھا ہے میٹھا پانی میٹھا نکلے تو اچھے اعمال اور کرموں کی بشارت ہے۔ کھاری نکلے تو یہ بُرے کرموں کا پھل ـــــ بہو بیگم نماز روزے کی پابند۔ اللہ کی مقبول بندی۔ ان کے کنوئیں سے میٹھا پانی نکلا۔ گاؤں والوں نے چندہ کر کے جو کنواں کھدوایا وہ سخت بنجر پیاسی

زمین میں تھا۔ بڑی کوشش سے پاتال تک کھدائی ہوئی تب کہیں پانی کی جھلک نظر آئی۔ چکھا گیا تو تلخ کھاری 'تیز' ایسے پانی سے سبزیاں، ترکاریاں کیا پنپ سکیں گی؟ گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو سخت حیرت تھی کہ ایک ہی زمین سے ایک جگہ کھاری پانی، دوسری جگہ میٹھا پانی کیسے نکلا! سب اوپر والے کے کرشمے ہیں۔ انسان کچھ نہیں کر سکتا۔

کتنی ہی بار بڑی بیگم ان لوگوں کو کتنے ہی موقعوں پر دھتکار چکی تھیں۔ مگر یہ لوگ وہ تھے جو برسوں سے اس حویلی کے وفادار تھے پھر ایک فلسفہ یہ بھی تھا کہ دھتکارنے کا حق بھی تو اسی کو ہوتا ہے جو پیار کرتا ہے۔ ان کے دلوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ بڑی بیگم دل میں پیار رکھتی ہیں صرف مونہہ سے کڑوے بول، بول لیتی ہیں۔

دینو مالی کی قیادت میں گاؤں کی عورتوں کا ایک وفد بڑی بیگم کی خدمت میں پہنچا۔

"آماں بیگم، آپ سے ایک درخواست ہے" اب آماں بیگم کے بعد بڑی بہو ہی گاؤں والوں کی آماں بیگم تھیں۔

بڑی بیگم نے بہت الجھ کر، مگر قدرے ضبط کے ساتھ پوچھا "کیا بات ہے؟"

"ہمارے کنوئیں کا پانی تو کھاری نکل آیا ہے آماں بیگم....."

بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بولیں — "اپنے اپنے اعمال کی بات ہے، یہ تو —"

دینو مالی رسان سے بولی۔ "آماں بیگم اگر آپ کی اجازت ملے تو ہم موٹھ اور پائپ لگوا کر اپنے کھیتوں میں سنچائی کر لیں....."

انھوں نے دوبارہ بات کاٹ دی۔ "میرے کنوئیں سے تم لوگ پانی لو گے؟ اس کو ہاتھ لگاؤ گے؟" آماں بیگم پانی اینچنے کو اپنی ہی جات کا کوئی نوکر لگوا دیں —"

آماں بیگم فصیل کی طرف گھومیں "اور اسی پانی سے میں نہاؤں گی وضو کروں گی؟

پھر میری کیا پاکی رہ گئی؟" نصیبن دبی زبان سے بولی۔ "بی بی جی اپنے مذہب میں ایسی پابندی کہاں ہے کہ ایک کنوئیں سے ہندو پانی لے تو مسلمان کے لئے وہ ناپاک ہو جاوے"؟

وہ چلائیں۔ "یہ گھر پنپنے والا نہیں ہے جہاں خدا کے احکام کی پابندی نہیں ہوتی وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ "تم لوگ یہ فرض کر لو کہ جیسے میں نے کنواں کھدوایا ہی نہیں۔"

دینو مائی نے اُن کے پاؤں پکڑ لئے۔ "اماں بیگم، یہ تو سوچو آدھی آبادی تو گاؤں سے چلی گئی۔ آدھی بھوکوں مر رہی ہے، کیسے گھر بار چلیں گے کیسے گجر ہو گی؟"

"یہ اپنے بھگوان سے پوچھو ــــ مجھ سے کیا پوچھتی ہو؟" اور تسبیح رولتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

اسی رات جب غضب کی گرمی پڑ رہی تھی، زمین تڑخی پڑ رہی تھی، کیڑے مکوڑے گھبرا کر باہر نکل آئے تھے ــــ بڑی بیگم کا اکلوتا بیٹا شمیم زماں پانی پینے کے لئے اٹھا جیسے ہی اس نے چھپر کھٹ سے پاؤں زمین پر لٹکائے اللہ جانے کون بلا نے پاؤں میں کاٹ کھایا کہ وہیں تیورا کر گر پڑا۔ دھڑ کی آواز پر بڑی بیگم کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ زماں زمین پر پڑا ہے اور پیروں کے پاس سے کالی کالی لمبی سی کوئی چیز سرسراتی نکلی چلی جا رہی ہے۔ غالباً سانپ تھا ــــ چیخ مار کر وہ پلنگ سے اتریں ــــ ساری حویلی جمع ہو گئی۔ حویلی کے باہر بھی ہاہا کار مچ گئی۔ لوگ بھاگتے دوڑتے آگے پیچھے حویلی میں جمع ہونے لگے۔ ہر شخص اپنی اپنی بولی بول رہا تھا۔ کوئی منتر کی رائے دے رہا تھا۔ کوئی شہر سے ڈاکٹر بلانے کو کہہ رہا تھا زماں بے ہوش تھا۔ بڑی بیگم کے حواس گم ہو چکے تھے۔

وہ پتھر کی مورت کی مانند جمی رہ گئی تھیں ـــــ عمر بھر کی کمائی آنکھوں کے سامنے لٹی جا رہی تھی۔ ساری زندگی کی کلفتوں کے بدلے بس یہی ایک پھل ان کے ہاتھ لگا تھا۔ آج ان کا بھی انت آگیا تھا۔ پھر انھوں نے بڑی دیر سے یہ دیکھا کہ بہت سی عورتوں کے ساتھ دینو مائی حویلی میں داخل ہو رہی ہے۔ اس نے آتے ہی کس کر اپنی ساڑی کا ایک ٹکڑا پھاڑا اور زماں کے پیر پر باندھ دیا ہے ـــــ اب اس نے اپنے ہونٹ اس نیلے نشان پر جما دیئے ہیں ـــــ لوگ ہیں ہیں کر رہے ہیں وہ مونہہ ہی مونہہ میں کچھ پڑھ کر تھوکتی جاتی ہے ـــــ دھیمی آواز جیسے پاتال سے آرہی ہے۔

"میں نے جندگی بھر ایسے ایسے دکھوں کا جہر پیا ہے کہ اس سانپ کے جہر کی کوئی کمیکت میرے پاس نہیں ....." وہ بدنصیب بال بدھوا تھی۔ اس نے چوس چوس کر سارا زہر پھینک دیا ہے۔ زماں ہوش میں آرہا ہے اور بڑی بیگم

بڑی بیگم خوشی اور دکھ کے بین بین ایسی سرحد پر کھڑی تھیں کہ اب نہ کسی سے کچھ لیتیں نہ چالتیں ـــــ دن بھر جانماز تھی اور وہ تھیں ـــــ زماں کمزور ہو کر پیلا پڑ گیا تھا۔ شہر سے ڈاکٹر بھی آیا ـــــ باپ بھی ـــــ علاج معالجہ ہو رہا تھا وہ روبصحت تھا۔ اور بڑی بیگم کا سر سجدے سے نہ اٹھتا تھا ـــــ

ابھی شاید مصیبتوں اور آزمائشوں کا دور شروع ہو رہا تھا۔ ایک رات بڑی بیگم کے دیکھتے ہی دیکھتے مویشیوں کے کوٹھے میں، جہاں سوکھا چارہ رہتا تھا، آگ لگی ـــــ گرمیوں کی آگ ایسی پھیلی کہ پلک جھپکتے میں شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ اور پھر بڑی بیگم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان کے پڑوسی جو سب ہندو تھے۔ اپنے اپنے گھروں سے نکلے، مٹکے، بالٹیاں، ڈونگے، جس کے جو ہاتھ لگا پانی سے بھر بھر کر دوڑنے لگے۔

جسے پانی میسّر نہ آیا، ریت سے پتیلے بھر بھر کر پھینکنے لگے۔ کئی جانور جل کر مر گئے کئی جھلس گئے۔ حویلی دھوئیں سے اٹ گئی۔ مگر صبح ہوتے ہوتے بل والوں نے آگ بجھا کر ہی دم لیا۔

بڑی بیگم شکریہ کا ایک لفظ تک نہ بول پائیں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہیں۔ جب ذرا آپے میں آئیں تو وضو کیا اور مصلّے بچھا کر عبادت میں مصروف ہو گئیں۔

گاؤں کے ہندوؤں نے مندروں میں چڑھاوے چڑھائے۔ مسلمانوں نے مسجدوں میں عبادتیں کیں کہ اب کی بار جو کنواں کھُدے اس میں میٹھا پانی نکلے۔

اس رات بڑی بیگم کے پاؤں دباتے نصیبن نے انھیں یہ اطلاع دی تو بڑی بیگم سوچ میں ڈوب کر کہیں دور سے بولیں: "اور جو اس بار بھی کھاری پانی نکل آیا تو؟"

نصیبن ٹھنڈی آہ بھر کر بولی: "پھر تو اس گاؤں والوں کا خدا ہی حافظ ہے۔"

بڑی بیگم پھر کچھ نہ بولیں۔

وقت ـــــ بے رحم وقت، جو گھڑی کی سوئیوں کی ٹک ٹک سے عبارت نہیں ہے ـــــ وہ تو عبارت ہے ان سے، اُن مصیبتوں اور غموں اور کٹھنائیوں سے جو دل کے دروازے پہ دھیرے دھیرے دستک دیتی ہیں۔ کھٹ کھٹ اسی وقت نے اب بڑی بیگم کے دروازے پر دستک دینی شروع کی ہے۔ ہرکارے نے شہر سے آنے والی چٹھی ہاتھ میں لا کر تھمائی ہے ـــــ بڑے سرکار دل کے دورے میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

یہ غم جیسے اُن کا نہیں، کیونکہ وہ تو یوں ہی ٹھونٹھ بنی بیٹھی ہیں، غم تو ان کا ہے

جو سب حویلی کے آنگن میں بیٹھے، کھڑے ہیں جو سسک سسک کر چلا چلا کر، چھپ چھپ کر، منہ پھیر پھیر کر رو رہے ہیں۔ یہ انسان ہیں یا حیوان؟ جذبات سے عاری جان دار! یہ تک نہیں سوچتے کہ ہم یہ آنسو کس کے غم میں، کس کی خاطر بہا رہے ہیں — جس نے ہمارے نذرانوں کو ٹھکرا دیا! جس نے ہماری محبت کو ٹھوکریں ماریں! جس نے ہمیں پانی کے لئے ترسایا! جس نے ہمیں اپنے پیار کو تڑپایا! جن تھالوں میں پیار سے صندل اور چندن سجا کر لائے تھے کہ تلک سجائیں اُن تھالوں کو اٹھا کر پھنکوایا — مٹی کے چراغ جن میں تیل کی بجائے ہمارے دل کا لہو جل رہا تھا، بھری دیوالی میں پھونکیں مار مار کر بجھا دیئے۔ پھر پیار کا وہ کون سا رشتہ ہے! کیسا پکا دھاگا ہے جو ٹوٹنے میں آتا ہی نہیں؟

یہ لیلا دتی ہے۔ یہ پارو ہے۔ یہ شنکر کی ماں ہے۔ یہ شانتی ہے۔ یہ منجو ہے۔ یہ دینو مائی ہے۔

یہ سب رو رہی ہیں — رہ رہ کر بڑی بیگم کی طرف دیکھتی ہیں کہ ان کو گلے سے لگا کر اُن کے دل کی بھڑاس نکال دیں۔ آنسو رک جائیں تو دل پر پتھر بن کر جم جاتے ہیں — انھیں بہنا ہی چاہیئے۔ ان چٹانوں کو پگھلنا ہی چاہیئے۔ مگر ہم انھیں ہاتھ کیسے لگائیں — بڑی بیگم کا پاکیزہ وجود کیسے برداشت کر پائے گا کہ ہم انھیں گلے لگائیں، ان کے گالوں پر بہتے آنسوؤں کو اپنے ناپاک آنچلوں سے پونچھیں؟ —

بعض تحریریں دل کی آنکھوں سے پڑھی جاتی ہیں — بڑی بیگم نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی سسکتی تڑپتی اُن بے چین آنکھوں کو دیکھا — زندگی بھر کی جمی ہوئی ساری نفرت ان کی اپنی آنکھوں کے راستے بہہ نکلنے کے لئے بے قرار ہو رہی تھی — چمپا کا نام مریم، کلثوم، گلشن، زیتون، وحیدہ، سلمیٰ بھی تو ہو سکتا تھا — اس کا اپنا قصور

کیا تھا! اُس کی جگہ کوئی مسلمان عورت میرے میاں کو ہتھیا لیتی تو ہی۔

"دینو مائی ....." بڑی بیگم کی آواز میں جیسے امرت گھلا ہوا تھا۔ "دینو مائی، تو مجھے گلے کیوں نہیں لگاتی؟" ان کی خشک آنکھیں رونے کو بیقرار ہو رہی تھیں۔

دینو مائی نے روتے روتے غیر یقینی اور حیرت بھرے انداز سے ان کی طرف دیکھا پھر وہ اٹھی اور تیر کی طرح چلی اور پھر یوں جگر پھاڑ کر دونوں روئیں کہ حویلی تھرا اٹھی۔ پاکی اور ناپاکی کے تصور سے پرے آج ان کا رُواں رُواں اس محبت بھرے لمس کی گرمی سے سرشار ہو اٹھا۔ دینو مائی کو کلیجے میں بھر کر تھرتھراتی آواز میں وہ بولیں۔ "دینو مائی — گاؤں والوں سے کہہ دو، کھاری پانی کا کنواں پاٹ دیں۔ میرے باغ بغیچے، کھیت کھلیان، کنواں، اس کا میٹھا پانی سب تم لوگوں کے لئے ہے۔ آج سے کھاری پانی تم لوگوں کو صرف ان دو آنکھوں سے ملے گا جو کسی مصرف کا نہیں، جو.....

دینو مائی نے ان کی بات کاٹ کر اُن کے آنسو اپنی انگلیوں پر موتیوں کے مانند سنبھال لئے — "نہیں بڑی بیگم ایسا مت بولو — یہ کھارا پانی بے مصرف نہیں یہ پانی تو وہ پانی ہے بی بی جس سے دل کی کھیتی سیراب ہوتی ہے جس سے دل کی بنجر دھرتی پر پھول کھل اٹھتے ہیں، جس سے ....."

اور اس کی اپنی آواز کھارے پانی کے سمندر میں ڈوب کر رہ گئی۔

پُوجا کا مان

موتی زور زور سے ڈکرا رہی تھی۔

گوری کو ہر چیخ کے ساتھ اپنا دل باہر نکلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا کلیجہ تھامے کھمبے کے پاس کھڑی تھی۔ شمبھو ہنس کر بولا۔

"گائے کے لئے اتنا جی کڑھاتی ہے ری ــــ؟" گوری موتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"انسان جنور سب کی تکلیپھ برابر ہوتی ہے۔ جیو تو اس کے بھی ہے۔ ہائے رام کیا تڑپ رہی ہے؟"

"تو تو بھول پھکر کرتی ہے ــــ دیکھ سانجھ تک بھگوان تیرے دوارے ایک سندر سی بچھیا بھیجتے ہیں۔ اچھا یہ بتا پوجا کھلائے کتنے جنوں کو نیوتا دے گی؟"

گوری چڑ گئی "تمہیں تو نیوتے کی پڑی ہے۔ میں کہتی ہوں، بیچاری اپنی جان سے نہ جائے۔ پہلا بچھت ہے!"

"تیرا بھی تو پہلا بچھت تھا کبھی ــــ بھول گئی کیا؟ ایسے ہی ڈکرا رہی تھی میرا ہاتھ پکڑ کر اپنا کہا سنا ایسے ماپھ کرالی تھی۔ جیسے مری تو جائے گی۔ اور پھر جب سوہنیا پیدا ہو گئی تھی تو کیسی گھس تھی۔ ساری تکلیپھوں کو بھول بھال کر ٹکر ٹکر تاکنی پڑی تھی اس کو۔" شمبھو موتی کے درد سے بے نیاز، پچھلے جیون کی خوشیاں اُلٹ رہا تھا ــــ گوری کو بڑھاپے میں بھی لاج آگئی۔

"کیا مور کو ہے۔ اس کے میرا پہلا بچھت یاد دلانے کا کون موکا تھا؟"
شمبھو ہنس پڑا۔ "بھی تو میرا کہنا ہے کہ تکلیپھ سبھی کو ہوتی ہے۔ جنور کو بھی انسان کو بھی۔ پر مرتا کوئی بھی نہیں۔"
موتی تڑپ کر زور سے ڈکرائی۔ پچھلے کوٹھے پر بندھے بیل نے چارا کھاتے کھاتے گردن گھما کر موتی کی طرف دیکھا۔ شمبھو کو پھر دل لگی سوجھی۔
"دیکھت ہے گوری ـــ بے چارا کھانا بھی بھول گیا۔ کیسے پلٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے ـــ" گوری چڑ گئی۔ "ہاں ہاں اب تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہی موتی..... اور وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ لاج سے اس کا بوڑھا منہ تمتما اٹھا.... شمبھو کچھ سمجھ کر مسکرا دیا۔
"تو پھر اور کیا بات ہے؟ ـــ اب بھلا وہ دوسرا بیل کیوں نہیں دیکھتا موتی کی طرپھ....." موتی دھڑام سے زمین پر گر کر تڑپنے لگی۔
"بھجول دل لگی کرتے کھڑے ہو۔ میں کہتی ہوں تمھیں کچھ بھی درد نہیں ـــ جاکر کسی کو بلا لاؤ ذرا۔" گوری شمبھو کو تقریباً ڈھکیل کر بولی۔ اب شمبھو کے چڑنے کی باری تھی۔ جھلا کر بولا۔
"تیرے بھیجے میں جرا اکل نہیں گوری۔ کیا وہ بھی کوئی استری ہے کہ اس کی جنائی کے واسطے دائی کو بلا لاؤں؟"
"ارے سن میرے پاس درگاہ کے بڑے پیر کا تاویج ہے۔ مجھے سکینہ نے دی تھی۔ جنور انسان کسی کو بھی تکلیپھ ہو سب کو اس سے چھائدہ ہو جاتا ہے۔ اس کے گلے میں لاکر باندھ دیتی ہوں۔ بھگوان تکلیپھ میں کچھ تو کمی کریں گے ہی۔" اور وہ کوٹھری کی طرف لپک پڑی۔
باندو کے جھونپڑے سے رام داس اپنے بیلوں کو ہنکاتا ہوا نکلا۔ شمبھو کو کھڑا دیکھ کر بولا۔

اسے بھائی ایسے پریشان پریشان سا ہے کھڑے ہو جی؟"

"ارے کچھ نہیں دادا۔ موتی صبح سبیرے سے تڑپ رہی ہے۔ مگر میرے گھر والی اس سے بھی جیادہ تڑپ رہی ہے۔ جیسے موتی کی نہیں خود اس کی جنائی ہو۔ میرا بھیجا چاٹ رہی تھی کہ کسی کو بلا کر لا۔ اب اللہ یہ پیر صاحب کا تا دیج لائی گئی ہے۔ کہتی تھی اس سے سب کی تکلیپھ دور ہو جاتی ہے۔" اتنا کہہ کر شمبھو زور سے ہنس پڑا۔ مگر رام داس سنجیدگی سے بولا۔

"ارے بھائی ہم تم ان عورتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ ان کے دل میں کتنی ممتا بھری پڑی ہے۔۔۔ دیکھنا جب تک موتی بچہ نہ جن لے، بھابی منہ میں دانہ بھی نہ ڈالے گی۔ اور پھر یہ بھی تو سوچو کتنے ارمانوں سے اس نے موتی کھرید کی۔ بچے کے سمان اس کا کھیال رکھتی ہے۔ اب اگر اس کی تکلیپھ پر دہ جی نہ کڑھائے تو کیا کرے بیچاری۔۔۔ اور بھائی جنائی کی تکلیپھ کا درد ہم مرد کیا جانیں؟"

کوٹھری سے تعویذ لے کر گوری باہر نکلی تو رام داس اپنے بیلوں کی رسی تھامے کھڑا تھا۔ گوری نے ایک ہاتھ لمبا گھونگھٹ کاڑھ لیا۔

رام داس ہنس کر بولا۔" بھابی پوسی کھانے جرور آؤں گا سانجھ کو۔"

گوری نیچی نگاہ کیے بولی۔" ارے دادا تم سے الگ کون پوسی کھائے گا بھلا۔۔؟ مگر پہلے اس بیچاری کی تکلیپھ دور ہو جائے جرا۔"

گوری نے درد سے تڑپتی چلاتی موتی کے گلے میں تعویذ باندھنے کے لئے ہاتھ بڑھائے تو اس کے آنسو ٹپک پڑے۔ اس نے تعویذ کی ڈوری میں گانٹھ لگاتے ہوئے من ہی من میں منت مانگی۔ بھگوان! میری موتی کی تکلیپھ دور کر دیں اور اس کی جان بچ جائے تو میں بیچ جاتی والوں کے پرانے مندر میں لیجا کر اس کے سیندور لگا دوں گی۔ اور

دو سیر دودھ سے بھگوان کی مورتی نہلاؤں گی۔

گوری کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر شمبھو کا من پگھل گیا۔ رام داس بوجھل اور بھاری بھاری قدموں سے بیلوں کو ہنکاتا چلا گیا۔ عورت اتنی درد مند ہو سکتی ہے کہ جانوروں کی تکلیف پر بھی آنسو بہائے؟ یہ انھیں معلوم نہ تھا۔ عورت کا یہ روپ آج تک ان دونوں کی آنکھوں سے مخفی تھا۔ شمبھو دل لگی بھول بھال کر حیرت سے گوری کو دیکھ رہا تھا۔ اور رام داس کے دل میں بھابھی کے لئے عقیدت اور عزت کا ایک دریا موجیں مارنے لگا تھا۔

سانجھ ہوتے ہوتے پورے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ شمبھو دادا کی گائے نے بچھیا جنی ہے۔ گوری کے پانو زمین پر پاؤں نہ ٹکتے تھے۔ وہ کبھی تو موتی کی پیٹھ سہلاتی کبھی بچھیا کے منہ پر ہاتھ پھیراتی۔ سوہنیا، راجو اور ٹچی تھان پر سے ہٹتے نہ تھے۔ گوری کو خوش اور مطمئن دیکھ کر شمبھو بھی خوش ہو رہا تھا مگر گوری کی خوشی سب سے بالاتر تھی۔ وہ یکساں موتی کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ موتی اپنی سیاہ اور بڑی بڑی خاموش آنکھوں سے گوری کو دیکھ رہی تھی، اس کی نگاہوں میں ہمدردی تھی۔ شکر مندی کا احساس تھا اور پھر وہ نگاہیں پھیر کر اتنی محبت سے بچھیا کو دیکھتی کہ گوری کا اپنا دل مامتا کے جذبات سے بھر جاتا۔ پہلے پہل ماں بننے کا جو احساس موتی کی نگاہوں سے چھلک رہا تھا وہ گوری کی نگاہوں سے چھپا نہ رہ سکا۔ وہ پلٹ پلٹ کر کوٹھے پر کھڑے بیل کی طرف یوں دیکھتی مانو کہتی ہو۔

"اب میں بھی ایک ماں ہوں۔ میرے تھنوں سے بھی دودھ کی دھاریں پھوٹ پڑی ہیں۔ تم اگر کھیت میں ہل چلاتے ہو تو کیا میں تمہارے بچے کو نہیں پالتی؟"

گلابی پھولوں کی رنگین چنریا اوڑھ کر گوری محلے ٹولے والوں کو پیسی کھانے کا نیوتا دینے چلی تو جہاں جاتی تو لوگ یوں بدھائی دینے لگتے گویا موتی کو بچھیا نہ ہوئی بلکہ

گوری کی اپنی لڑکی کو بیٹی پیدا ہوئی ہو۔ اور یوں بھی گوری موتی کو سوہنیا اور تجھی سے الگ کہاں سمجھتی تھی۔ اور آج تو وہ ایسا محسوس کر رہی تھی، گویا وہ پہلی بار "نانی" بن گئی ہو۔ اگر سوہنیا کو بیٹی ہوتی تو بھی وہ اتنی ہی خوش رہتی۔

راموسا کا نے پوچھا۔ "بھابی بچھیا کس پر گئی ہے، باپ پر کہ ماں پر؟"

گوری جھینپ گئی۔ "ارے کا بات کرتے ہو سا کا؟" پھر تھوڑی دیر چپ رہ کر بولی۔ "بالکل موتی جیسی ہے۔ ویسا ہی سفید سفید روئی کے گالے جیسا بدن۔ ویسی ہی کالی آنکھیں ہاں آنکھوں کے بیچ ماتھے پر ایک بھورا سا دھبہ بھی ہے۔"

ساکی نے دل کھول کر آشیرواد دی۔ "بھگوان تیرا تھان بھرا پرا رکھیں۔ ہم کسانوں کی جندگی تو جانوروں ہی کے دم سے ہے۔ اور پھر گائے ہو تو بات ہی کیا ہے۔ اری بھابی بڑی بھاگیہ دان ہے تو، پہلے ہی بکھت بچھیا پائی۔ گوری کا دل خوشی سے اچھلا جا رہا تھا۔ سکینہ کے گھر پہنچکر گوری نے دعاؤں کا طومار باندھ دیا۔" بہن تو موتی نہ آج میری موتی بچتی۔"

"اے ہے کیا ہو گیا تھا؟" سکینہ سوپ پٹخ کر جلدی سے آئی۔

"کچھ نہیں ہوا ری"۔ موتی نے بچھیا جنی ہے۔" مگر بیچاری ——"

سکینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اے بہن مبارک ہو۔"

دوسرے کونے سے فاطمہ چلائی۔ "موسی ہمیں پوری کھلانے نہ بلاؤ گی؟"

گوری زور سے ہنس پڑی۔ "ارے کونے میں بیٹھی بیٹھی کیا چلا رہی ہے۔ سامنے آ۔" پھر سکینہ سے بولی۔ "میں تو بھی گئی ہاتھ سے پہاڑ جیسی گائے۔ مگر اللہ کا بڑا بھلا تھا سکینہ! تیرے پیر جی کے تاویج سے ساری تکلیف دور ہو گئی —— تاویج باندھتے ......" اور فاطمہ کو آتا دیکھ کر موسی کا لہجہ دھیما پڑ گیا ——

"موسی تم بڑی خراب ہو۔ رات کو چھپا ہوئی اور اب نیوتا دینے چلی آرہی ہو" اس کی معصوم شکایت پر گوری مسکرائی۔

"اوئی بٹیا بیاں تو ـــــ مرنے بھر کی فرصت نہ تھی۔ ایسی پھکر تھی میرے کو کہ" فاطمہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تمہیں فکر تھی تو سوہنیاں یا فاطمی کو بھیج دیتیں"۔

بڑھیا مجوب ہو گئی۔ لاجواب ہو کر بولی "اچھا چل چل۔ اب تم تینوں ملکر ہی پوسی بنانا۔ بوڑھے لوگ اگر کوئی گلتی کر بھی دیں تو بچے ماپھ کر دیا کرتے ہیں"۔

گوری اور شمبھو میں کھٹ پٹ چلی آرہی تھی۔ شمبھو کہتا تھا دودھ تو اتنا اترا نہیں اور مارے گھمنڈ کے سارے گاؤں کو نیوتا دے آئی ہے۔ گوری کا کہنا تھا کہ دوسرے دن کی گائے کو بھلا اترے گا کتنا۔ دودھ ملا کر بڑھالیں گے پوسی۔ اب اتنے لوگوں کو کہہ چکی ہوں تو ٹال تو نہیں سکتی۔

باہر تینوں لڑکیوں نے مل کر جھاڑ جھوڑ کر گوبر سے لیپ پوت کر صاف ستھری جگہ بنا دی تھی۔ دروازے پر آم کے پتوں اور گیندے کے پھولوں کی لڑیاں باندھ دی تھیں۔

فاطمہ اور سوہنیا ہم عمر تھیں۔ کام کرتے کرتے مذاق بھی کرتی جاتیں۔ سوہنیا کہہ رہی تھی۔

"اب یہ پاجامہ کرتا چھوڑ کر ساڑی پہننا شروع کر دے بھیا تھا۔"

ڈھیلا ڈھالا کالی دائل کا کرتا اور لال لٹھے کا پاجامہ پہنے۔ سر پر چھوٹی سی اوڑھنی ڈالے وہ کوٹھے کے باہر پانی چھینٹنے میں مصروف تھی۔ گھڑے کے بوجھ سے اس کے صحت مند لال لال گال دمک گئے تھے اور پسینہ کی ننھی ننھی بوندیں اسکی ناک پر جم گئی تھیں۔

کرتے سے پسینہ کی بوندیں پونچھ کر وہ مسکرائی "کیوں بھلا ـــــ میں اچھی نہیں دکھتی کرتے پاجامے میں؟"

سوہنیا بھی مسکرائی "ہونہوں ـــــ ایسا تھوڑے ہی کہتی ہوں۔ بھلا کہہ رہی تھی۔ چاندی کی پور

ے تیری سگائی والے آرہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں لڑکی کے لئے چڑھاوے میں ساڑی پولکا لائیں گے۔

فاطمہ شرم سے لال ہوگئی ۔۔ "تیری سگائی والے آئیں گے تو میں بھی تجھے چڑاؤں گی! اتنا یاد رکھ لے۔"

سوہنیا زور سے ہنسی۔ "اری میں چڑاتی کہاں ہوں تجھے۔ تیرے ہی بھلے کی کہہ رہی تھی ۔۔ میری سکھی کو اس میں بڑا مزا آئے گا جب دولہا اپنے ہاتھوں سے ساڑی پہنادے گا۔"

فاطمہ سوہنیا کے پیچھے لپکی ۔۔۔۔ تھمی آکر بولی۔

" ماں کہتی ہے سارے محلہ والے آگئے اور تم دونوں نے اب تک پوری آگ پر بھی نہیں چڑھائی۔ جب دونوں تھان پہ پہنچیں تو گوری انہیں دیکھتے ہی پیار بھرے طعنے سے چڑچڑائی۔

"کیوں ری پاپا تو ۔۔ گنتہ تو بڑا دکھاتی تھی کہ موسی نے بلائی نہیں۔ اسی لئے تو نہیں بلاتی کہ سارا کام چوپٹ کر دیتی ہے آکر۔ اب یہ کوئی کھیلنے کا بکھت ہے۔" فاطمہ زور سے ہنس پڑی۔

سوہنیا بڑبڑائی۔ "اب رہنے بھی دو ماں۔ اگر ایک دن کام نہ کریں تو سارا گھر کھانے کو دوڑتا ہے۔ دو گھڑی ہنس کھیل لیا تو کیوں چڑتی ہو۔"

" سسرال جاکر ایسی ناک بتانا۔ پھر پتہ چلے گا۔ یہ تو میکہ ہے کوئی کچھ نہ بولیگا۔"

سسرال کا نام سنکر دونوں کو ہنسی آگئی۔ سوہنیا فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹتے ہوئے چوکے میں گھس گئی۔

" ساون کی چڑیاں ہیں یہ چھوکریاں بھی' دو چار دن رہیں گی پھر سے اُڑ جائیں گی۔ مارو پیٹو گالی دو تب بھی کچھ نہ بولیں! سچ ہے گائے میں اور چھوکری میں کوئی انتر نہیں آج گھربار چھوڑ کر چلی جائیں تو یہی گھر کاٹنے کو دوڑے گا۔ گوری کا دل بھر آیا۔

شنکر اور گوری کھانے کو نہیں بیٹھے۔ سب کو پروستے ہی رہے۔ عورتوں کو پروسنے کا سارا بار فاطمہ اور سوہنیا نے اپنے سر لے لیا۔ ہنستی جاتیں اور پروستی جاتیں۔

گوری کو رام داس نے آواز دی " بھابی تم بھی آ بیٹھو ہمارے ساتھ تو مجا دونا ہو جائے۔"

گوری مسکرائی " بھگوان نہ کرے۔ مردوں کے سنگات بیٹھ کر چبڑ چبڑ منہ چلاؤں۔ اتی عمر ہو گئی۔ آج تک تو نہیں بیٹھی۔"

رام داس سمجھ گیا، بولا " بھائی تمہاری گھروالی سچ مچ لکشمی ہے۔ بھاگ بھر جائیں جس کے بھی ایسی عورت ملے!"

پان اور بیڑی کا دور چلنے لگا تھا۔ ہنسی مذاق ہی ہو رہا تھا۔ بچے کھا پی کر اودھم مچانے لگے تھے۔ رام داس کی گھروالی نے اندر سے آکر ایک موٹے موٹے دانوں کی مالا سب کو دکھائی۔ " یہ میں میلے سے خرید کر لائی تھی، اتی خوبصورت مالا ہماری کی بچھیا ہی پہن سکتی ہے۔ دوسرا کوئی نہیں" اور اس نے ہاتھ اونچا کر کے بھری محفل کو مالا دکھائی۔ جنگلی بیروں کے، اتنے بڑے بڑے ہرے لال پیلے موتیوں کی مالا تھی؟ میلوں میں گایوں بیلوں، کے لئے خاص طور پر بیچی جاتی ہیں۔ گوری شکر مندی کے طور پر مسکرائی۔

" کوئی بچھیا کو اٹھا لاؤ، میں اپنے ہاتھ سے پہناؤں گی؟" کلوا اٹھ کر بھاگا اور دونوں ہاتھوں میں بچھیا کو اٹھا لایا۔ رام داس کی گھروالی نے ہاتھ بڑھا کر مالا اس کی گردن میں ڈال دی۔ نام رکھنے کا حق مالا پہنانے والے کو پہنچتا ہے۔ اس کا نام بھی میں ہی رکھوں گی۔"

شمبھو ہنس کر بولا " بھابی تیرے کو بیٹا ہو گا تو اس کا نام میں اپنی پسند سے رکھوں گا۔"

رام داس جھینپ گیا۔ بھابی بھی شرما گئی " بوڑھے ہو گئے پر مجاک کی عادت نہیں گئی تمہاری۔"

"ارے بھابھی تو کیا سمجھتی ہے کہ میرا بال بچہ......"

ابھی شمبھو کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی۔ کہ اکدم باہر سے رامو دوڑتا ہوا آیا۔ اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ باہر کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"بابو! جمین دار کا آدمی آیا ہے"

ہنستے مسکراتے چہروں پر گویا اداسی پڑ گئی۔ شمبھو گھبرا کر بولا۔

"جمین دار کا آدمی"

"ہاں بابو! جمین دار کا آدمی آیا ہے۔ کہتا ہے تمہاری بچھیا لے کر جائیں گے"

سب کے چہرے فق ہو گئے۔ شمبھو نے بھابی کے پاس سے اٹھا کر بچھیا گوری کے ہاتھ میں دے دی۔ "تے اسے موتی کے پاس چھوڑ دے۔ میں دیکھتا ہوں کہ کیا معاملہ ہے" گوری کا دل کانپ رہا تھا۔ "کیا بچھیا دو گے اپنی"؟

"تو کچھ سمجھتی تو ہے نہیں۔ بچوں ٹائیں ٹائیں کرتی ہے جمیندار جی سے ٹکر لیگی کیا؟"

شمبھو کمزور دل کا آدمی تھا۔ ذرا سے دباؤ پر اکدم سے ہار مان لیتا تھا۔

گوری نے بچھیا کو سینے سے بھینچ لیا۔ اس کی ممتا جاگ اٹھی تھی۔ "اتنے دنوں کی آسا پوری ہوئی ہے ہماری۔ جمیندار تا کیا ہے۔ ہجاروں گیاں ہیں اس کے پاس ہم گریب آدمی ہیں ہمیں ستا کر کیا ملے گا اسے۔"

شمبھو نے ناگواری سے اُسے گھورا اور باہر نکل گیا۔

گوری نے بچھیا کو موتی کے پاس بٹھا دیا۔ موتی اکدم اُسے محبت سے چاٹنے لگی۔ گوری نے بچھیا کا مُنہ موتی کے تھن سے لگا دیا۔

بچھیا ہر قسم کے خطروں سے لاپروا چُسر چُسر دودھ پیئے جا رہی تھی۔ موتی کتنی سطمئن تھی ــــ!! ــــ گوری کے آنسو بھر آئے۔ وہ ایسا انیائے کبھی نہ ہونے دے گی۔

ہائے یہ بچھیا چلی گئی تو موتی کے بھی اکڑ کے نہ رہ جائیں گے۔

شمبھو اندر آیا تو اُس کا منہ اُترا ہوا تھا۔ "کیا کہتا ہے جمیندار کا آدمی؟" کئی آوازوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

"ہم نے پوجا کا مان نہیں دیا تھا اُسی کا بھگتنا ہے یہ۔"

"گریبوں سے جبردستی مان لے کر پوجا چڑھائی جائے تو بھگوان بھی خوش نہیں ہوتے۔" بھابی بگڑ کر چلائی۔

ماتا دین دور بیٹھا بیڑی کا کش لے رہا تھا صلح کے انداز میں بولا۔ "ارے بھابی مگر پوجا کے مان میں بچھیا کا کیا دکھل؟"

شمبھو نے بے بسی سے آسمان کی اُور دیکھا۔ "یہ تو بھگوان ہی جانیں مگر اتنا تو میں بھی دیکھتا تھا کہ موتی کا بھی تبھی سے اس پر بڑے لوگوں کے "دانت تھے"۔"

سکینہ بولی ــــ "پوجا کا مان ہی دینا ہے نا ــــ یہ جوار کا تھیلہ بھرا رکھا ہے اٹھا کر منہ پہ مارو ــــ کھلا لو جتنا کھلانا ہے پجاریوں کو ــــ"

گوری بولی۔ "بہن! گھسٹتے ہیں اکل گائب ہو جاتی ہے۔ بھلا جمیندار جوار کیا کرے گا۔ اُسے دھان یا گیہوں ہونا تھا۔ اور جوار لے بھی لے تو ہم کیا بھوکوں مریں گے۔ اتنی ہی تو جواری باکی رہ گئی ہے"۔

سکینہ چپ رہ گئی، اُس کا بس چلتا تو زمیندار کا منہ نوچ لیتی۔ تھوڑی دیر چپ رہ کر بولی۔ "گوری میرے گھر دھان کا ایک بورا رکھا ہے۔ ویسے تو بیجنے کو رکھا ہے مگر اس کی وجہ سے تیرا تھان سونا ہونے سے بچ جائے تو کیا بات ہے۔ اگر زمیندار کا آدمی مانے تو دہی دیدیں گے؟"

گوری کا دل چاہا سکینہ کے پیر چوم لے۔ خوش ہو کر بولی۔ "مگر جمیندار کا آدمی اپنے

تب نا؟"

"تو پوچھ کیوں نہیں لیتے۔ جاؤ بھیّا رام داس پوچھ آؤ کہ دھان لے لوگے؟"

زمیندار کے آدمی نے پھٹکار بتائی۔ "حضور کا حکم یہی ہے کہ بچھیا لے آؤ۔ میرے ہاتھ کی بات نہیں کہ بچھیا کے بدلے دھان لے جاؤں اور نوکری گنوا بیٹھوں۔"

رام داس ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا مگر اُس وقت وہ بھی ٹھنڈا نہ رہ سکا

—— "اور اگر بچھیا پیدا ہوتے ہی مر جاتی تو کیا لیتے جمیندار جی؟"

"میں نے کہہ دیا نا مجھے نہیں معلوم، ہم خود نوکر ہیں جو حکم ملے گا اسے بجا لائیں گے۔ پہلے سے مان دیتے تو کاہے کو یہ آفت آتی، تم لوگوں کو خود گھر لٹانے میں مزہ آتا ہے۔ سب کے پاس پیسے تھے۔ شمبھو پر کہاں کی غریبی ٹوٹ پڑی تھی۔ سب معلوم ہے، سالے گھروں میں اناج چھپا چھپا کر رکھتے ہیں۔"

"بس بہت کہہ چکے۔ بچھیا نہیں ملے گی۔"

"وہ زہر خند ہنسی ہنسا۔" تم یہ بھول رہے ہو کہ تم کس سے بات کر رہے ہو۔"

رام داس سنبھلا۔ "حضور ہمارے مائی باپ ہیں۔ آپ خود سوچئے کہ بچھیا بنا گائے کیسے جندہ رہے گی؟"

"تو گائے بھی ساتھ کر دو ——" (پلان پہلے ہی سے بنا بنایا تھا)

رام داس سناٹے میں آ گیا ——

گوری نے چھاتی پیٹ لی۔ "کیا انیائے ہے بھگوان گھر کی لکشمی پر ہی آفت آئی۔"

شمبھو ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا تھا —— "مجھے تو کچھ نہیں سجھائی دیتا بھائی۔"

تمھیں سجھائی نہیں دیتا پر مجھے تو سجھائی دیتا ہے۔ کون ماں کا لال ہے بچھیا یا گیا کو ہاتھ تو لگائے جرا؟"

شمبھو نے گوری کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ گوری بھگوان کے لئے چپ رہ جا کیں سے مٹکر لینے چلی ہے۔ آج جمیندار بے دکھل کر دے تو دلنے دانے کو ترسیں گے۔ جانے دے بچھیا اور گیا دونوں کو بھی۔ مالوم ہے انیائے ہے مگر صبر کرلے۔ بھگوان کھد جالم سے بدلہ لے لے گا۔"

گوری چِلّائی۔" اتنے دنوں سے میں نے پال پوس کر اولیاد کے جیسا بڑا کیا۔ اب اُسے الگ کر دوں۔" پھر سب عورتوں کی طرف دیکھ کر بولی۔" اپنے بچّے کو کوئی ماں کبھی چھوڑ سکتی ہے۔ موتی میرا بچّہ ہے، میرے کلیجے کا ایک ٹکڑا ہے۔ اور بچھیا میرے کلیجے کے ٹکڑے کا ایک ٹکڑا ہے۔ میں کسی کو بھی الگ نہیں کر سکتی۔ موتی تو مر جائے گی چلّا چلّا کر۔ اس کی گیلن[1] کیسے پھڑپھڑائے گی میرے بھگوان۔"

سب چپ چاپ تھے اور ایک دوسرے کو بے بسی سے دیکھ رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ زمیندار کی ناانصافی ہے۔ بھلا دو دن کی بچھیا بھی کبھی گائے سے الگ کی جا سکتی ہے۔ مگر انصاف کرنے والا کون تھا؟"

بھابھی بولی۔" وہی تو میں کہوں کہ پوجا کا مان لینے سے پورے گاؤں پر داؤ پڑا، نہیں پڑا تو شمبھو دادا پر۔ تبھی سے گابھن گائے آنکھوں میں تھی۔ سوچ لیا ہو گا کہ اب کا بدلہ تب نکال لوں گا۔ اور وہی ہو کر رہا۔ گائے بھی تو کتنی عمدہ ہے۔ کتنے کو بچھیا کھریدی تھی شمبھو دادا ـــ بھلا پڑا کر کیا گائے اٹھائی ہے کہ واہ۔"

"دو بیسی اور پانچ میں۔" شمبھو مری ہوئی آواز سے بولا۔

اتنی اچھی گائے بھلا وہ کرائی چھوڑنے والا تھا۔ اب تو اس کے من کی مراد پوری

---

[1] کوکھ

ہونے کا بکھت آیا ہے۔ دیکھ لینا بچھیا کے بہانے گائے بھی ہاتھ صاف نہ کرے تو میری چوٹی مونڈ ڈالنا۔"

زمیندار کی اس قسم کی کارستانیوں سے سب باخبر تھے۔ کوئی کچھ نہ بولا۔

"ارے لاتے ہو بچھیا یا آکر میں ہی اٹھا لوں۔" محفل میں ایک سنسنی دوڑ گئی۔

"میں کیا کروں بھگوان۔" شمبھو بے بسی سے پکارا۔

"پھکر مند کیوں ہوتے ہو بھائی۔" چلو سب مل کر جمیندار جی کے پاس پھر یاد کریں گے۔ کیا کھبر بھگوان دل میں دیا ڈال دیں اُن کے۔" رام داس بولا۔

شمبھو کے منہ پر رونق آ گئی۔ بیج زمین کے اندر ہی اندر جل رہے ہوں بارش کی کوئی آس نہ ہو، اس سمے بادل گھر کر آ جائیں تو بارش ہو یا نہ ہو کالے بادلوں کو دیکھ کر کسان کی روح خوش ہو جاتی ہے کہ اب بادل تو چھا ہی گئے بارش بھی ہو ہی جائے گی۔ یہی آس اُس وقت شمبھو کے دل پر کالا بادل بن کر چھا گئی۔ خوش ہو کر بولا۔

"بھائی یہ بات تو کھوب کہی تم نے۔ کون جانے بھگوان دل میں دیا بھر دیں۔ جا کلو بچھیا اٹھا لا۔"

"اب بچھیا کو لے جانے کا کون کام ہے۔" گوری چلائی۔

"جمیندار سے پہلے تو اس کا آدمی ہی جنہ نہ چھوڑے گا۔ بچھیا تو ساتھ لے جانا ہی ہوگا۔ اگر مان گیا تو واپس لے آئیں گے۔ ورنہ پھر تو دینا ہی پڑے گا۔"

"ہاں ہاں پھر تو دینا ہی پڑے گا۔" گوری غصہ سے چیخی۔ "کیسے مورکھ ہو تم۔"

"جا کلو بچھیا اٹھا لا۔" شمبھو گوری کی بات کو نظر انداز کر کے بھاری آواز سے بولا۔

ابھی مالا پہنانے کلّو کیا خوشی خوشی بچھیا کو اٹھا لایا تھا۔ اب اس کے قدم نہ اٹھتے تھے۔ شمبھو اس کے دل کی حالت بھانپ گیا۔ درد آمیز مسکراہٹ سے بولا۔

"بیٹیوں کو بھی تو کبھی نہ کبھی بدا کرنا پڑتا ہے کلّو بھائی۔ ایسا سمجھ لو آج اپنی بیٹی بدا ہو رہی ہے۔" کلّو کی آنکھیں بھر آئیں۔

گوری دوڑ کے کھونٹے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھیں بُری طرح برس رہی تھیں۔ سب عورتیں دم سادھے کھڑی تھیں۔ شمبھو نے بڑی ہمت سے بچھیا کو دیں اٹھائی۔

"کلّو دادا تم میرا کلیجہ نکال کر لے چلے ہو۔"

کلّو کا من کانپ اٹھا۔ اُس نے بچھیا کو زمین پر بٹھا دیا۔ اور دوڑ کر باہر نکل گیا۔ شمبھو بھائی۔" وہ بھرے گلے سے بولا۔" یہ میرے بس کا روگ نہیں ہے۔"

ایک عجیب سی اُداسی پورے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ گوری کے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ پوری کی پوری کانپ رہی تھی۔ شمبھو کے قدم جہاں کے تہاں گڑے رہ گئے۔ وہ جی کڑا کر کے بولا۔

"گوری یہ سمجھ لے کہ آج تیری بیٹی کی بدائی ہے۔" گوری کچھ نہ بولی۔ آنسوؤں کا ایک اور ریلا اس کا چہرہ دھو گیا۔

"رام داس! تم ہی اٹھا لو بھائی۔ میرے تو ہاتھ نہیں اٹھتے۔"

رام داس نے بچھیا کو اٹھا لیا۔ دو قدم چلا ہوگا کہ موتی تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور رسّی سمیت بچھیا کی طرف لپکنے لگی۔ اس کی خاموش اور بے زبان آنکھوں نے آنے والے خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ وہ بے کسی سے بچھیا کو دیکھ رہی تھی۔ رام داس لڑکھڑا گیا۔

شمبھو بھائی! اس بے جان کی تڑپ مجھ سے نہ سہی جائے گی۔ دیکھتے نہیں

اس کی آنکھوں کو کیسی بے کسی سے ٹکر ٹکر تاک رہی ہے؟"

شمبھو منہ سے کچھ نہ بولا۔ اس نے آگے بڑھ کر موتی کی رسّی کھول لی۔ "چلو اس کو بھی لے چلیں۔"

گوری اب تک چپ چاپ کھڑی تھی! اس کی آنکھیں بُری طرح برس رہی تھیں مگر اب وہ چُپ نہ رہ سکی۔ اکدم وہ شمبھو کے پیروں پر گر پڑی "تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔ میرا گھر سُونا نہ کرو ناتھ۔" تم نے بیاہ منڈپ میں کہا تھا۔ جیون بھر میرا دل نہ توڑو گے آج سارے جیون کا بدلہ چکا دو۔ آج اپنی بات کی لاج رکھ لو۔ میرا دل نہ توڑو۔ میرا آنگن سُونا نہ کرو ناتھ" اور وہ پچھاڑیں کھانے لگی۔ شمبھو کا من کانپ اٹھا اور وہ بالکل پہلی بار، باوجود ضبط کی کوشش کے اس کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے ——

شمبھو نے رسّی چھوڑ کر گوری کو سنبھالا۔ "تو میرا دل بھی چھوٹا کئے دیتی ہے گوری۔ ابھی واپس لے آتا ہوں بچھیا اور گیا دونوں کو۔"

رام داس کے پیچھے شمبھو گائے کی رسّی تھامے نکلا۔ باہر اچھا خاصا ہجوم ہو رہا تھا۔ سب زمیندار کی حویلی جانے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ گوری کے آنسوؤں نے سب کے دل میں ہمت بھر دی تھی۔ زمیندار کا آدمی اتنے سارے آدمیوں کو چلنے پر آمادہ دیکھ کر دل ہی میں مسکرایا (زمیندار جی ضرور تمہاری فریاد سُن لیں گے —— نادان لوگ!)

ایک ایک دو دو کر کے لوگ جمع ہوتے جا رہے تھے۔ عورتیں چپ چاپ کھڑی ہجوم کو آگے بڑھتا دیکھ رہی تھیں کہ اتنے میں پھر گوری دوڑتی ہوئی آئی۔ "میں بھی چلوں گی زمیندار کے گھر —— تمہاری پھریاد نہ سنے گا تو میں اُس کے پاؤں

پکڑ لوں گی اپنے آنسوؤں سے اس کے پیر دھو ڈالوں گی تب تو مانے گا۔؟؟

"بھابھی تمہارے چلنے کی جرأت نہیں۔ اگر میرے کو وہاں گستہ آگیا تو بھجو کھون کھرابا ہو جائے گا" رام داس بولا۔

گوری بے بسی سے اُسے دیکھنے لگی۔ پھر لپک کر اٹھی۔ بولی۔

"میں نے منت مانی تھی کہ مندر لے جاکر موتی کے سیندور لگاؤں گی مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی جرا ٹھہر! میں ابھی لاتی ہوں" تھوڑی دیر میں گوری دوڑتی آئی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ سیندور کی کٹوری سے چٹکی بھر سیندور نکال کر اس نے موتی کے ماتھے پر بکھیر دیا۔ "میری بیٹی آج سسرال چلی ہے سُونی مانگ سے کیسے جانے دوں بھلا؟" موتی خاموش نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ سکینہ نے منہ میں آنچل ٹھونس لیا تھا پھر بھی سسکیوں کی آواز دب نہ سکی۔ فاطمہ اور سوہنیا پاس کھڑی پُرنم آنکھوں سے گائے کو دیکھ رہی تھیں۔ بالکل ایسے انداز سے کہ بڑی بہن بدا ہو رہی ہے۔ اور آنسو بھری آنکھوں سے اشاروں ہی اشاروں میں جیجا جی سے کہتی ہو کہ ہماری بہن کو لئے تو جاتے ہو مگر دل نہ دکھانا اس کا۔ مگر یہ کیسی بارات تھی جس میں نہ جیجا جی تھے، نہ ڈولی نہ قہقہے تھے، نہ خوشیاں تھیں، صرف آنسو تھے، مسکراہٹ کا کہیں بھی پتہ نہ تھا۔

۔۔۔ صرف آنسو ہی آنسو ـــ جن میں دلوں کی خوشیاں ڈوب رہی تھیں۔

"ہچا مہ بہن! میرا کلیجہ کٹا جاتا ہے" سوہنیا فاطمہ سے لپٹ گئی۔ "نراش نہ ہو میری سوہنیا ابھی دادا دالیس لے آتے ہیں دونوں کو بھی"

ہجوم آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ عورتیں سسکتی رہیں۔ بھیگی آنکھوں سے کھڑی دیکھتی رہیں۔ اور ہجوم موڑ پر سے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو گوری بوجھل بوجھل

قدموں سے اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی۔ گائے کا تھان سونا سونا پڑا تھا۔ بیل خاموشی سے چارہ کھا رہے تھے۔ اور آنگن کے بیچوں بیچ موتی کا کھونٹا تنہا کھڑا تھا۔ گوری کا دل بھر آیا۔ وہ کھونٹے کے پاس جاکر بیٹھ گئی اور اپنی گلابی پھولوں والی چُنریا میں منہ چھپا کر زور زور سے چیخیں مار مار کر رونے لگی۔

۳

"ڈیڈی یہ کمبخت سلام ہی نہیں کرتا بھئی۔" سروج منمنائی۔

"ڈیڈی یہ کمبخت سلام ہی نہیں کرتا بھئی۔" رمیش نے سروج کی نقل اتاری۔

سروج مسلسل آٹھ دنوں سے اپنے بندر کو سلام کرنا سکھا رہی تھی مگر وہ سیکھ ہی نہ چکتا تھا۔

"دیکھ رمیش! میں تمہیں پیٹ دوں گی پکڑ کر۔ تم میری نقل کیوں اتارتے ہو بھئی؟"

"میں نے تمہاری نقل کب اتاری؟ میں تو ڈیڈی سے کہہ رہا تھا کہ یہ بندر بڑا نامعقول ہے سلام ہی نہیں کرتا۔"

"بندر میرا ہے یا تمہارا۔"

"تمہارا۔"

"تو پھر میرا بندر سلام کرے نا کرے تم سے مطلب؟"

"تم میری بہن ہو یا نہیں۔"

"ہوں!"

"تو پھر میری بہن کا بندر سلام کرنا نہ سیکھے تو مجھے اس کی کوئی فکر ہی نہیں گویا۔"

"لیکن مجھے آپ کی فکر کی کوئی ضرورت نہیں صاحب! میں آپ پٹ لوں گی اپنے بندر سے۔ تم جو اپنے کُتّے کو بچانا سکھا رہے تھے اس کا کیا بنا؟"

رمیش مسکرایا۔" وہ نہیں ناچ سکتا۔ تھک گیا میں تو کوشش کر کے۔"

"بالکل ناچ سکتا ہے جناب! یوں کہئے آپ کو نچانا نہیں آتا۔"

"ہاں یوں بھی ہو سکتا ہے۔ مگر اصل بات تو یہ ہے کہ نچانا کچھ لڑکیوں کو ہی اچھا آتا ہے۔ تم وہ کپور کو خوب نچاتی تھیں بھئی۔"

سروج تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے شانوں تک کٹے ہوئے بال ایک جھٹکے سے سینے پر آ گرے۔ گال تمتما گئے۔ آنکھیں غصّے کے مارے پھیل گئیں۔ کیا کہا۔؟ ۔ میں نچاتی تھی؟ وہ آپ ناچتا تھا۔ تم اپنی بہن کو ایسا کہتے شرم محسوس نہیں کرتے رمیش ۔؟"

وہ ڈھٹائی سے ہنستا رہا۔" ارے بھئی اس میں شرم کی کیا بات ہے ظاہر ہے وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے!"

" سروج شرما گئی۔" کرنے لگے نا بیوقوفی کی باتیں۔"

" میں تم سے بڑا ہوں۔ مجھے بیوقوف نہ کہو سروج دیوی۔"

" بہت دیکھے ایسے بڑے بھائی۔"

" ممی سے کہہ دوں گا سروج مجھے بیوقوف کہتی ہے۔"

" اور میں ڈیڈی سے کہہ دوں گی رمیش مجھے خواہ مخواہ چھیڑتا ہے۔"

" مجھے لڑنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ سرجو کی بچّی۔ مگر دیکھ مجھ سے لڑائی کر کے گھاٹے میں رہے گی تو!"

" کیوں بھلا۔"

" کیونکہ آج میں شہر جا رہا ہوں۔ کار لے کر اور تجھے چھوڑ دوں گا یہیں۔"

" تو یہی وجہ ہے جو مجھے ڈرائیونگ نہیں سکھاتے تم۔"

"وہ تو ظاہر ہے۔"

"تو میں ڈیڈی سے سیکھ لوں گی۔"

"بس سکھا چکے ڈیڈی۔"

"دیکھ لینا تم بھی۔"

"گاڑی ٹکرا دو گی کہیں بھی۔"

"جیسے تم نے ٹکرائی تھی نا۔"

"جھوٹ بکتی ہے تو۔"

"ڈیڈی سے پوچھوا دوں۔"

"چلو بھلا۔"

ڈیڈی اپنے کمرے میں آرام کرسی پر لیٹے سگار پی رہے تھے۔ بازو میں میز پر بہت سارے کاغذات دھرے تھے۔ وہ اس وقت کسی گہری سوچ میں ڈوبے دکھائی دیتے تھے۔ کیونکہ ان کی آنکھیں بند تھیں (جو صرف شدید سوچ اور پریشانی کی حالت میں بند ہوتی تھیں۔

"ڈیڈی! رمیش نے اپنی شوخ ایک بار درخت سے ٹکرا دی تھی نا؟" سروج چلاتی ہوئی آئی۔ زمیندار صاحب نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ابھی وہ بات کی نوعیت بھی نہ سمجھ پائے تھے کہ رمیش بول اٹھا۔

"ڈیڈی، میں نے کبھی اپنی گاڑی درخت سے ٹکرائی؟"

"نہیں تو۔" وہ بے سوچے سمجھے بول اٹھے۔

"اب بتایئے سروج دیوی؟" رمیش نے اکڑ دکھائی۔

"ڈیڈی بھول گئے ہوں گے۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

زمیندار صاحب نے بڑے پیار سے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔

"کیا بھول گیا ری تیرا ڈیڈی"

"دیکھئے ڈیڈی یہ رمیش کہتا تھا کہ مجھے چھوڑ کر.....

اُسی وقت ایک خدمتگار کمرے میں داخل ہوا۔ "حضور کسانوں کی ایک ٹولی آئی ہے۔ حضور سے ملنا چاہتی ہے۔

زمیندار صاحب اٹھ کھڑے ہوگئے۔ "کس لئے آئے ہیں وہ لوگ ہے"۔ انھوں نے گرجدار آواز میں پوچھا۔

"یہ تو نہیں معلوم حضور"

زمیندار صاحب اور ان کے پیچھے پیچھے سروج باہر چلی گئی۔ ملازم باہر جانے لگا تو رمیش نے اسے روکا۔

"تمہیں نہیں معلوم کہ یہ لوگ کیوں آئے ہیں؟" اُس نے گہری گہری نظروں سے ملازم کو دیکھا۔

صبح ہی صبح زمیندار صاحب نے شمبھو کی بچھیا منگوائی تھی۔ رمیش بٹھیک کے بازو والے اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ زمیندار صاحب کی آواز سُن کر اس کی آنکھ کھُل گئی تھی اور اسے پتہ چل گیا تھا کہ ڈیڈی کیا کر رہے ہیں۔ گاؤں کی چھوٹی سی دنیا میں کوئی بھی بات آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ چاہے وہ گائے کی جنائی ہو۔ یا مہتو چمار کی لڑکی کے حرام کے بچے کی خبر ہو۔ رات ہی کو بڑی حویلی میں یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ شمبھو کی گائے نے بچھیا جنی ہے۔ رات کے کھانے پر زمیندار صاحب اور ان کی بیگم میں اسی مسئلہ پہ بات چیت بھی ہوئی تھی۔ رمیش اپنی جگہ ہونٹ کاٹتا رہ گیا تھا۔ اور صبح ہی صبح جب اپنی بات کو عملی جامہ پہنانے کو زمیندار صاحب نے اپنا آدمی شمبھو کے گھر بھیجا۔ اُسی وقت سے رمیش کا ــــ موڈ آف ہو گیا تھا۔ اور وہ صبح سے

اپنی بہن سے لڑ لڑا کر اپنے دل کی جلن مٹا رہا تھا۔ زمیندار صاحب کے بارے میں ان کے اپنے بیٹے کی رائے کچھ اچھی نہیں تھی۔ وہ انھیں منہ پر تو کچھ نہ کہتا مگر دل میں انھیں بہت ظالم سمجھتا۔ حقیقتاً وہ تھے بھی ایسے ہی۔ آج کا واقعہ ایسا نہ تھا کہ رمیش اُسے آسانی سے بھلا دیتا۔ اس نے ملازم کو گھورا "تمھیں نہیں معلوم"

"وہ بوکھلا گیا۔ نہیں حضور"

"تم چھپا رہے ہو"؟

"حضور میں غریب آدمی ہوں"

"اسی لئے تو پوچھتا ہوں"

وہ رُک رُک کر بولا "حضور بڑے سرکار نے شمبھو دادا کی بچھیا منگوالی ہے۔ حضور دو دن کی بچھیا ہے۔ شمبھو دادا نے پوجا کا مان نہیں دیا تھا اسی لئے"

"شمبھو کون ہے"؟! اس نے بات کاٹ کر پوچھا!

"ایک غریب کسان ہے حضور"

"تو اب وہ لوگ کہنا کیا چاہتے ہیں"

"حضور ــــ" وہ کچھ رکا۔ "وہ کچھ نہیں کہنا چاہتے اور سب کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ بچھیا پورے دو دن کی بھی نہیں ہوئی حضور اور پھر یہ بات بھی ہے کہ شمبھو کے گھر والی کو گائے سے بڑی محبت ہے۔ شمبھو بچھیا کی بھوک کے خیال سے گائے لے آنے پر بھی مجبور ہو گیا۔ اب وہ زور و کر جان دے رہی ہے حضور اصل بات تو یہ ہے کہ کسان کی زندگی، کسان کے گھر کی رونق جانور ہی ہوتے ہیں۔ اور پھر گائے تو....."

"تمھیں یہ ساری باتیں کس نے بتائیں"؟ رمیش اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی پوچھ بیٹھا"

"حضور! ہم ایک ہی برادری کے لوگ ہیں۔ ہمارے دکھ سکھ ایک ہیں۔ ہمارے جیون الگ الگ نہیں ہیں۔ میں جو چار حرف پڑھ کر بڑے سرکار کے یہاں نوکری کرنے لگا ہوں۔ تو اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ میں ان سے الگ ہو گیا ہوں۔" اور یہ بات کہہ کر خود ہی ڈر سا گیا۔ مگر رمیش نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا وہ باہر نکل گیا۔

سیڑھیوں سے نیچے کسان کھڑے تھے۔ پھٹے پرانے میلے کچیلے کپڑے پہنے۔ ہاتھ جوڑے یوں گھگھیا رہے تھے کہ پتھر بھی پسیج اٹھے۔ مگر زمیندار صاحب ٹس سے مس نہ ہو رہے تھے۔ رمیش کے دل میں ایک لمحہ کے لئے شدید نفرت پیدا ہوئی۔

"حجور ہمارے مائی باپ ہیں۔ آپ ہی نہیں سنیں گے تو پھر ہماری پھریاد کون سنے گا۔"

"تم یہ جانتے ہو کہ تم نے پوجا کا مان نہیں دیا تھا۔"؟

شمبھو نے سہم کر سر ہلا دیا۔

"تو پھر تمہارا رونا گڑگڑانا فضول ہے۔ پوجا رک نہیں سکتی۔ مان کسی بھی صورت وصول کرنا ہے ہمیں۔"

"مگر حجور پوجا اور بچھیا میں کیا سمبندھ ہے؟" رام داس بولا۔

زمیندار صاحب مسکرائے۔ "بچھیا بیچ کر پیسے وصول کئے جائیں گے اس طرح تمہاری طرف سے پوجا کا مان وصول کر لیا جائے گا۔"

"حجور میں گھر کا سامان اور بچا کھچا اناج بیچ کر مان دیدوں گا۔" شمبھو نے آگے بڑھ کر سیڑھیوں میں سر ٹیک دیا۔

"سامان اور اناج پہلے بھی تو بیچا جا سکتا تھا۔ پھر پہلے ہی کیوں نہ دیدیا؟ اب بچھیا دیتے جان نکلتی ہے۔ تو سامان اور اناج بیچنا سوجھتا ہے۔ مجھے تم لوگوں کی

بہانے بازیاں خوب معلوم ہیں۔ بچپنا اس لئے لیتا ہوں کہ آئندہ کے لئے نصیحت ہو جائے
اور مال دیتے سمے بہانے نہ سوجھیں۔"

"شمبھو لاجواب ہو گیا۔" واقعی اناج پہلے بھی تو بیچا جا سکتا تھا۔

رام داس آگے بڑھ کر بولا۔ "ہجور! اب کی دفعہ ما پھ کر دیں پھر سے ایسی گلتی نہ ہو گی۔"

مگر ہجور نے جواب دینے سے زیادہ مسکرا دینا ہی بہتر سمجھا۔

رمیش کا خون کھول اُٹھا۔ اس نے دھیرے سے سروج کو پکارا۔ "شی شی سروج!

"کیا ہے؟"۔ وہ اُس کے قریب آئی تو رمیش اُسے کھینچتے ہوئے اندر لے آیا۔

"کیا ہے بھئی؟ اتنا مزہ آ رہا تھا وہاں!" وہ چڑچڑائی۔ رمیش کا دل چاہا کہ
اس کے گورے گورے گالوں پر طمانچہ لگا دے، مگر وہ ضبط کر گیا۔

"بھارت ناٹیم کا ڈانس ہو رہا تھا کیا؟ وہاں جو مزہ آ رہا تھا؟" (سروج کو بھارت
ناٹیم بہت پسند تھا)

وہ غصہ ہو کر بولی۔ "جو کچھ بھی ہو رہا تھا۔ مگر یہ کہو مجھے کیوں بلایا۔"

وہ نرم پڑ گیا۔ "ایک بات کہوں؟"

"کیا ہے؟"

"پہلے یہ بتا مان لے گی میری بات؟"

"شاید! اس نے اپنی پتلی سی ناک سکیڑی۔"

"شاید وایدنہیں۔ ماننا ہی ہو گا۔"

"اونہوں۔ — تو بولو تو سہی" وہ ادب سے بولی۔

"ڈیڈی تجھے بےحد پیار کرتے ہیں نا؟"

"تو پھر — ؟"

"اُن سے میری خاطر ایک چیز مانگ لے۔"

"وہ کیا"؟۔

"کہنا کہ شمبھو دادا کی گائے اور بچھیا اُسے لوٹا دیں۔"

اس میں تمہاری خاطر کیا بات ہوئی ـــ "تمھیں بچھیا گیّا سے مطلب؟" وہ بڑی حیرانگی سے بولی ـــ

"بس ایسے ہی میرا دل چاہتا ہے ایسے۔"

"اچھا دل ہے تمہارا ـــ ڈیڈی کیوں واپس کریں گے! اس نے پوجا کا مان جو نہیں دیا ہے۔"

"پوجا کا مان ـــ پوجا کا مان ـــ" رمیش چڑ کر بولا۔ "جسے دیکھو یہی گاتا ہے۔ ارے اُس کا گھر کا گھر پریشان ہو رہا ہے رو رو کر اور یہاں پوجا کی پڑی ہے آپ لوگوں کو۔ بڑے مذہبی بنتے ہیں ڈیڈی۔ اتنا تو معلوم ہوگا کہ سب سے بڑی پوجا سب سے بڑی عبادت ہے غریبوں سے ہمدردی، غریبوں کا دل رکھنا۔"

"سب شمبھو کی بدمعاشی ہے۔ گھر میں اناج تو موجود ہے پہلے ہی سے کیوں نہ دے دیا۔"

رمیش نے اُسے گھور کر دیکھا (بالکل اپنے باپ کی بیٹی تھی!) غصّہ سے بولا۔ "اب اگر اناج بیچ کر پوجا کا مان دے گا تو دو مہینے فاقے کریگا بیچارہ۔"

"تو پھر اناج نہ بیچے، اپنی بچھیا ہی دیدے۔ چلو ہوگئی خلاصی۔"

رمیش نے غصّہ سے ہاتھ مٹکا کر اُس کی نقل اتاری۔ "اپنی بچھیا ہی دیدے، چلو ہوگئی خلاصی۔ اچھا یہ بتا اگر کوئی زبردستی تیرے پالتو جانور یا تیرا بندر ہی لے بھاگے تو تو کیا کرے گی!"

"منہ نوچ لوں گی اُس کا۔" وہ سچ مچ ایسے غصہ ہو گئی جیسے کوئی واقعی اس کا بندر لیکر بھاگا جا رہا تھا۔

"پھر یہ بھی تو سوچ ــــ" رمیش نے اُس کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا ــــ "کہ بندر سے تجھے مالی فائدہ نہیں۔ صرف تیری دل بہلائی کا ذریعہ ہے وہ۔ اور یہاں گائے سے تو شمبھو کی کتنی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔

سروج اُسے چپ چاپ دیکھ رہی تھی۔ رمیش پھر بولا۔" اور مجھے یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ڈیڈی اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں میں خود دخل دیتے ہیں۔ ایک زمیندار کے یہ شایان شان نہیں یہ بات۔ مندر کے ممبر خود پوجا کا سامان وصول کرلیں گے۔ ڈیڈی کیوں خود کو بدنام کرتے ہیں۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو رمیش۔ اصل میں ڈیڈی انصاف پسند ہیں۔ وہ ہر بات کا فیصلہ خود اپنے ہاتھوں کرنا چاہتے ہیں ــــ" (اس طرح انصاف کرنے میں بھی تو مالی فائدہ ہوتا ہے میری پاگل بہن، تیرے ڈیڈی کی تجوری روز بروز کتنی بوجھل اور وزنی ہوتی جا رہی ہے۔")

رمیش مسکرایا۔" خیر تو نہیں کہنا چاہتی تو نہ کہہ۔ مگر مجھے امید ہے کہ آج نہیں تو کبھی تو تو میرا ساتھ دے گی اور اس لئے دے گی کہ میں کوئی غلط بات نہیں کر رہا ہوں۔ غریبوں کے ساتھ مل جُل کر کام کرنے سے، ہمدردی کرنے سے، مصیبت میں ان کے کام آنے سے، دل کو جو خوشی ہوتی ہے اُس سے تو ابھی واقف نہیں ہے۔ مگر کبھی تو تیری آنکھیں کھلیں گی ہی۔ مجھ سے غریب شمبھو کی تڑپ نہیں دیکھی جاتی۔ ہم بڑے لوگ ہیں دل کھول کر غریبوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اپنی حماقت سے ہم بھول رہے ہیں کہ جنھیں ہم چھوٹا سمجھ رہے ہیں وہی ہم سے بڑے ہیں چھوٹے تو ہم ہیں جو ان کی محنت کے سہارے جی رہے ہیں۔ اگر آج کسان اناج اگانا چھوڑ دے تو کیا تیرے ہاتھوں میں اتنی

طاقت ہے کہ صرف ایک وقت پیٹ بھر کھانے کے لئے تو کھیت جوت سکے، ہل چلا سکے، اناج پیدا کر سکے۔" ؟

"بھیا!" سروج سہمی ہوئی آواز میں بول اٹھی۔ "میں ابھی ڈیڈی سے جا کر کہتی ہوں۔"

ڈیڈی بک بک جھک جھک کر کے (مگر اپنی بات منوا کے) پھر اپنے کمرے میں آ بیٹھے تھے۔ گائے اور بچھیا تھان پر بندھ گئے تھے۔ شمبھو اپنی مرضی سے گائے چھوڑ گیا تھا۔ گائے بچھیا کے لئے تڑپتی، یہ اس سے دیکھا نہ جاتا، تھوڑے دن دودھ نہ ملے گا نہ سہی، پر بے زبان کی ماستا تو تڑپنے سے بچ جائے گی۔

"ڈیڈی!" وہ زمیندار صاحب کی گردن سے جھول گئی۔ "ہماری ایک بات سنیں گے؟"

"بھلا اپنی بیٹی کی بات نہ سنیں گے ہم۔"

"تو ڈیڈی شمبھو دادا کی بچھیا واپس کر دیجئے انھیں۔"

زمیندار صاحب چونک پڑے۔ "یہ بات تجھے رمیش نے سکھائی ہے کیا؟" وہ غصہ سے بولے۔ ادھر کئی دنوں سے وہ رمیش کے رویے میں تبدیلی دیکھ رہے تھے اور کئی بار رمیش کو کھیتوں پر جاتا دیکھ چکے تھے۔

"نہیں تو!" وہ صاف مکر گئی۔ "میں اپنے دل سے کہہ رہی ہوں۔ بیچارے کتنا روتے تھے۔ پھر کیا کہتے ہیں ڈیڈی آپ؟؟"

وہ سنبھلے۔ مسکرائے — پھر بولے — "ہاں — ہاں یہ کون بڑی بات ہے!"

(یہ کون سی بڑی بات تھی۔ شمبھو کا تھان اجڑ چکا تھا۔ گائے بچھیا زمیندار جی کے گھر بندھ چکی تھی۔ اب بیوقوف اولاد ناسمجھی سے ضد کرے تو جھوٹا وعدہ کر لینا کون بڑی بات تھی)

رمیش اور سروج گھوڑوں پر صبح ہی صبح کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ رمیش

سفید شرٹ اور سفید ہی پینٹ پہنے تھا۔ سر کے بال ہوا کے جھونکوں سے اڑے جا رہے تھے۔ صبح کی تازی ہوا سے اُس کے گال دمک رہے تھے اور چہرہ چمک رہا تھا۔ سروج کے بدن پر کورڈرائے کی نیلی پینٹ تھی۔ بند گلے کی تنگ نیلی جرسی پہن کر اور نیلے رومال سے اڑتے ہوئے سنہری بالوں کو سمیٹ کر اُس نے جو ٹھوڑی کے نیچے گرہ دے رکھی تھی۔ اس لباس میں وہ کوئی انگریز لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔

"سروج! تو نے اب تک صرف حویلیاں ہی دیکھی ہیں۔ آج میں تجھے غریب کسانوں کی جھونپڑیاں دکھاؤں گا۔"

"اور تم نہیں دیکھو گے؟" وہ بچوں کے معصوم انداز میں بولی۔

"میں؟" وہ ہنسا۔ "میں تو ہزاروں بار دیکھ چکا ہوں۔"

سروج نے اسے حیرت سے دیکھا۔ "ہزاروں بار — مگر کہاں؟"

"کالج سے ڈبکی مار کر بھاگ جایا کرتا تھا۔"

"مگر کہاں بھئی؟"

"شہر میں جہاں میرا کالج ہے۔ وہاں سے دس بیس کوس پہ ایک دیہات ہے۔ ہیرا گاؤں — بس اپنے شیام نگر جیسا ہی ہے، وہاں پر میں اتنی بار گیا ہوں کہ میرے دل و دماغ میں بس وہی کسانوں کی زندگی رچ بس گئی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہی اصل زندگی ہے — میں نے وہاں ہل چلائے — کھیت گوڑے — بیج بوئے — درانتی سے فصل کاٹی — زخم بھی پائے۔ یہ دیکھو ایک بار درانتی سے انگوٹھا کٹ گیا تھا۔ مگر سروج یہ حقیقت ہے کہ انہی زخموں نے مجھے حقیقی زندگی سے قریب تر کر دیا ہے۔ میں نے وہاں کسان بن کر زمیندار کے ظلم بھی اٹھائے جبکہ میں دھوتی پہنے کھیت میں دوسرے کسانوں کے ساتھ کام کر رہا تھا اور زمیندار صاحب کم آؤ مجھ

اور دوسرے کسانوں کو بیگار پر پکڑے گئے تھے۔ اتنی بیدیں پڑی تھیں کہ پیٹھ چھل گئی تھی کئی دنوں تک کروٹ نہیں لے سکتا تھا۔ اور پھر یہی واقعہ نہیں۔ میں نے ہر قسم کا تجربہ حاصل کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اب زمینداروں کو دیکھتے ہی میرا جی جل اٹھتا ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے ـــ" وہ زور سے ہنسا۔ "کہ میں خود زمیندار ہوں۔"

"سروج حیرت سے سن رہی تھی۔ بولی۔" مگر تمہیں ہیراگاؤں جانے کا موقع کیسے مل جاتا تھا؟"

"یہاں تو میری زندگی کا رخ ہی بدل گیا ہے۔ دو سال پہلے ـــ یاد ہوگا میں گرمی کی تعطیلات میں گھر نہیں آیا تھا۔ ڈیڈی کو لکھ دیا تھا کہ میں یہیں رہ کر اسٹیڈی کر رہا ہوں مگر دراصل میں ہیراگاؤں میں چلا گیا تھا۔ ہریندر کے ساتھ۔ وہاں میں نے زندگی کا اصل روپ دیکھا اور پھر تو میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ ـــ چھٹی ملی کہ اور بھاگا ہیراگاؤں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ ہریندر کو پتہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ کسان مجھے اپنا مہمان بنا کر بڑے خوش ہوتے تھے ـــ یہاں رہ کر میں نے کسانوں کی اصلاح بھی تو کی۔ ایک مرتبہ لگان کے معاملے میں کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی تو ہم سب اسی طرح زمیندار جی کے گھر گئے تھے جیسے کہ اس دن تمہو دادا کسانوں کے ساتھ گئے تھے ـــ"

"پھر زمیندار جی نے سنی تھی تمہاری فریاد؟" وہ ہنس کر بولا۔

"انہیں کیسے نہ سنتا۔ اس کے باپ کو بھی نہ چھوڑتے ہم۔"

"تو کیا پورا لگان معاف کرالیا تھا؟"

رمیش ہنسا۔ "دو پیسے میں دو آنے بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔"

دونوں خاموشی سے چل رہے تھے۔ رمیش بولا۔ "ہیراگاؤں سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔" "کالے میں……"

سروج نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مگر میں پوچھتی ہوں تم اپنے دیہات پر نہیں دیکھ سکتے تھے زندگی کا اصلی روپ یہاں کچھ نہیں سیکھ سکتے تھے تم! اپنے ہی آدمیوں میں مِل جُل کر تم بڑی اچھی طرح سکتے تھے!!"

ہرگز نہیں، ڈیڈی کے ہوتے بھلا ایسا ممکن ہے۔ میں تو کھیتوں ہی کی طرف گھومنے کی غرض سے نکلتا تھا تو ڈیڈی اتنے ناراض ہوتے ہیں کہ اُن کا بس چلے تو مجھے بھی گھوڑے کی طرح اصطبل میں باندھ رکھیں وہ زور سے ہنسا۔ "مگر مجھے تو اس میں کوئی برائی نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ اب تو میں یہ چاہتا ہوں کہ زمینداری کا یہ ٹھاٹ باٹ چھوڑ کر سادہ سا کسان بن جاؤں۔"

"اور ڈیڈی کے نام کو بٹہ لگا دوں۔" سروج نے ہنس کر اس کا جملہ پورا کر دیا۔ رمیش ہنس پڑا۔

"یہ تمہاری خام خیالی ہے۔" ڈیڈی کے نام کو بٹہ کیسے لگ سکتا ہے بھلا۔ میں تو جس طریقہ سے کسانوں میں گھل مِل جانا چاہتا ہوں اُس سے ہمارا نام اونچا ہو جائے گا۔ غریبوں کی محبت اور ہمدردی حاصل کر لینا، اُن کے دل جیت لینا، یہ کیا کم بات ہے۔"

"یہ کہو نا، جس رکابی میں کھا رہے ہو اسی میں سوراخ کرنے پر تُل گئے ہو تم؟"

"نہیں سروج یہ بات نہیں ہے۔" وہ بڑی محبت سے بولا۔ "ہم دونوں ایک ہی بات سوچتے ہیں مگر سوچنے کا طریقہ الگ الگ ہے۔ میں سمجھتا ہوں میرا طریقہ زیادہ صحیح ہے۔ میں رکابی میں سوراخ کرنے نہیں جا رہا ہوں بلکہ ٹوٹی ہوئی رکابی کو جوڑنا چاہتا ہوں، سمجھیں؟"

سامنے ہی ہرے بھرے کھیت لہرا رہے تھے۔ لمبے لمبے، ہرے ہرے مکئی اور جوار کے بھٹے ہواؤں سے اِدھر اُدھر جھول رہے تھے۔ گیہوں کی لمبی لمبی بالیاں سر سرا رہی تھیں۔

تھوہر کے چھوٹے چھوٹے پودے ہوا میں جھوم رہے تھے۔ سروج چپ چاپ بھائی کی باتیں سن رہی تھی۔ رمیش کھیتوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"یہ اناج کھیتوں سے کاٹ لیا جائے گا تو کسانوں کے دل بجائے خوشی کے غم سے بھر جائیں گے، لگان کے بہانے مالگزاریوں کے بہانے، پوجا کے ان کے بہانے طرح طرح کے حیلوں حوالوں سے آدھا اناج زمیندار کے گھر پہنچ جائے گا۔ اور جنہوں نے یہ اناج پیدا کیا ہے وہی دانے دانے کے لئے ترسیں گے۔ اور ان کے بچے میں کیا آئیگا — وہی سال میں چھ مہینے فاقے۔"

"یہ کہو! ڈیڈی کے دشمن ہو گئے ہو تم۔"

"بالکل پاگل لڑکی ہے اکدم" رمیش زور سے ہنسا۔ "میں اپنے باپ کا دشمن کس طرح ہو سکتا ہوں بھلا۔ میں تو سیدھی سادی بات کہتا ہوں۔ کہ بجائے راجے مہاراجوں کی طرح حکم چلانے کے ہم خود کسانوں میں مل جل کر کام کریں۔ ان پر ظلم نہ کریں، اُن کی زمینیں ان ہی کے پاس رہنے دیں۔ آج کسان لوگ ہم سے یوں ڈرتے ہیں جیسے لوگ جنگلی جانوروں، شیروں، چیتوں، بچھوؤں سے ڈرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اِس رعب داب اور ظلم کی حکومت کو توڑ کر مزے سے محبت سے یکسانیت سے کیوں نہ رہیں؟ نہ کوئی چھوٹا نہ کوئی بڑا۔ وہی جو ہمارا بلکہ ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔"

"مگر اس سے ہمیں کیا فائدہ ملے گا بھئی؟" سروج ایک بوڑھے آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ جو اپنے کھیت کے منڈیر پر گیلی مٹی تھوپ رہا تھا۔

رمیش ہنسا۔ "تمہاری نظر میں یہ کوئی فائدہ ہی نہیں۔ سب کسان چین اس سے اپنے اپنے کھیتوں میں بغیر کسی ڈر اور دباؤ کے بے فکری سے اناج اگائیں گے۔ نہ لگان کی زیادتی کا خطرہ نہ بے دخل ہو جانے کی فکر۔ ان غریبوں کی زندگی تو مجھے ہی معلوم ہے۔ کچھ لوگ

بھی اس لئے کہ بھگوان نے قسمت سے مجھے موقع دے دیا تھا اُن لوگوں کی زندگی قریب سے دیکھنے کا۔ ڈیڈی فضول اتنا ظلم کرتے ہیں۔ میرا اپنا یہ خیال ہے کہ بغیر ظلم کے بھی حکومت چل سکتی ہے۔"

سروج ناگواری سے بولی۔ "ڈیڈی بھی کیا کریں؟" تمہارے ہی لئے تو وہ سرماری کرتے ہیں۔ تم ہی ان کے اکلوتے لڑکے ہو ظاہر ہے یہ ساری جمع جتھا تمہارے ہی لئے ہے۔"

رمیش بھڑک اٹھا۔ "بہت خوب! یہ آج نئی بات معلوم ہوئی کہ یہ سب میرے لئے ہو رہا ہے۔ اگر آج میں ڈیڈی سے یہ بات کہہ دوں کہ مجھے روپیہ پیسہ کچھ نہیں چاہیے تو کیا ڈیڈی زمینداری کو لات مار دیں گے۔ ڈیڈی کی رگوں میں جاگیرداری خون دوڑ رہا ہے۔ اور ان کے دل و دماغ میں حکومت کرنے کی بڑی خواہش تھی۔ اس خواہش سے وہ روگردانی نہیں کر سکتے۔"

کیا تمہیں اس چیز سے انکار ہے کہ تمہاری رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے۔" سروج تیکھے پن سے بولی۔

رمیش سنجیدگی سے بولا۔ "میں اس بات کو بڑی سنجیدگی سے مانتا ہوں۔ مگر یہ بھی تو ہے کبھی کبھار ماحول انسان کو بدل کے رکھ دیتا ہے۔ میں نے کسانوں کی زندگی دیکھی۔ اُن کے ساتھ میں کچھ دن رہا۔ بس میرے دماغ نے وہی اثر قبول کر لیا۔ اور مجھے حیرت ہے کہ مجھ میں یہ تبدیلی اتنی جلدی کیسے آ گئی۔ مگر حیرت سے زیادہ مجھے خوشی ہوتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کبھی نہ کبھی کچھ تو کرنا ہوگا۔ اور اب تو روز بروز میں اپنے ارادوں کو مضبوط پاتا ہوں کہ میری جاگیر بھی چلی جائے تو بھی کوئی پرواہ نہیں۔"

سروج کچھ نہ بولی۔ گھوڑے اب اسی کھیت کے پاس سے گزر رہے تھے، جس کی منڈیر پہ ایک بوڑھا آدمی مٹی تھوپ رہا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں قریب آئیں تو اس نے سر گھما کے

پیچھے دیکھا مگر بے تعلقی سے پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ رمیش حیرت سے بولا۔
"ارے یہ تو شمبھو دادا ہے۔" شمبھو اپنے کھیت کی منڈیر پر مٹی اور اینٹیں رکھ کر اسے اونچا کر رہا تھا۔
رمیش نے گھوڑا روک لیا۔ "کیا کر رہے ہو دادا؟"
بوڑھا شمبھو حیران رہ گیا۔ وہ ایک نظر رمیش کو دیکھتا پھر اکدم سروج کو دیکھنے لگ جاتا۔ ان کی گوری گوری رنگتیں، انگریزی وضع قطع کے کپڑے۔ اور اونچے اونچے گھوڑے دیکھ کر وہ سٹ پٹا گیا اور بوکھلاہٹ میں رمیش کے سوال کا جواب بھی نہ دے سکا۔
سروج انگریزی میں بولی۔ "معلوم ہوتا ہے انہوں نے ہمیں پہچانا نہیں۔"
بات ٹھیک تھی۔ رمیش اور سروج شہر میں کالج میں پڑھتے تھے۔ ماہ دو ماہ کے لیے گاؤں آتے تو بنگلہ پر ہی رہتے، یہ تو پہلا اتفاق تھا کہ دونوں کھیتوں کی طرف نکل آئے تھے۔ ورنہ ہمیشہ پچھم کی طرف بہنے والی ندی کی طرف ہی سیر کو جاتے۔ شمبھو نے رمیش کو کئی بار کھیتوں میں گھومتا دیکھا تھا۔ مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ زمیندار جی کا بیٹا ہے۔
رمیش متانت سے بولا۔ "دادا ہمیں پہچانتے نہیں؟ ہم زمیندار جی کے بچے ہیں؟"
بوڑھے شمبھو کے ہاتھ سے اینٹ چھوٹ گئی۔ بوکھلا کر بولا۔
"ہجور! میرے گھر میں اناج نہیں ہے۔ کھالی تھوڑی سی جواری پڑی ہے۔" اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی، مٹی سے لتھڑے ہوئے اس کے ہاتھ تھر تھر کانپ رہے تھے۔
رمیش انگریزی میں سروج سے بولا۔ "دیکھتی ہو سروج ڈیڈی کا نام سنتے ہی غریب کیسے کانپ اٹھا۔ ایسے میں حکومت پھلا کرتی ہے۔ پھٹا بک جائے تو بغیر دوا دارو کے ہی پھوٹ پڑتا ہے۔ ایسا ظلم، اور سروج چل سکتا ہے؟"

سروج منہ سے کچھ نہ بولی۔ مگر اس کے چہرے پر جو ندامت چھا گئی تھی۔ وہ رمیش سے چھپی نہ رہ سکی۔ رمیش ہنس کر بوڑھے سے مخاطب ہوا۔ "نہیں دادا ہم تمہیں کوئی حکم دینے یا تمہارا اناج چھیننے نہیں آئے ہیں ہم تو تمہارے کھیت اور گھر دیکھنے آئے ہیں۔"

شمبھو کو اتنے بڑے اعزاز کی خواب میں بھی نہ سوجھ سکتی تھی کہ زمیندار جی یا اُن کے بچے اس کا گھر دیکھنے آسکتے ہیں۔ وہ بھول اٹھا مگر دوسرے ہی لمحہ اس کے دل کو شک نے آگھیرا کہیں اس میں بھی زمیندار جی کی کوئی مصلحت نہ ہو۔

رمیش چہرے سے اس کے جذبات بھانپ گیا۔ بولا۔

"تمہارا گھر کہاں ہے دادا؟"

بوڑھے نے سامنے ہاتھ ہلا دیا۔

"ہمیں اپنا گھر بتاؤ گے دادا؟" سروج میٹھی آواز سے بولی۔ اس کے لہجہ میں شمبھو کے لئے ہمدردی پا رہی تھی۔ رمیش مسکرا کر رہ گیا۔

"آپ تو ہمارے مائی باپ ہیں ہجور۔ آئیے سامنے ہی ہمارا جھونپڑا ہے۔" اور وہ آگے آگے چلنے لگا۔ رمیش اور سروج اپنے اپنے گھوڑوں سے اتر پڑے اور باگیں تھام کر شمبھو دادا کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ چلتے چلتے رمیش یوں ہی پوچھ بیٹھا۔

"شمبھو دادا! تمہاری بچھیا تو اب بڑی ہو گئی ہو گی؟"

شمبھو نے پلٹ کر دیکھا اس کی آنکھوں سے بے بسی ٹپک رہی تھی۔ وہ ایک منٹ چپ، بول اٹھا۔ "آٹھ چار دن میں کیا بڑی ہو گی ہجور۔ مگر موٹی کھوب ہو گئی ہو گی۔ اپنے گھر رہتی تو آدھا دودھ بیچ ڈالتے، کچھ کھا لیتے۔ اب تو سارا دودھ وہ خود ہی پی لیتی ہو گی، ہجور۔ انسان اور جنور کی بات نہیں ہے ہجور۔ بے پھکری سے کھانے کو ملے تو روٹی کھوب آنگ لگتی ہے۔" اور وہ بناوٹی ہنسی ہنس پڑا۔

رمیش بے تابی سے بول اُٹھا۔ "تو تمہاری بچھیا تمہارے پاس نہیں ہے؟"

"نہیں ہجور —— جمیندار جی کے گھر ہے۔"

رمیش نے سروج کو دیکھا اور سروج نے رمیش کو —— رمیش کے قدم سُست پڑ گئے۔

سروج تو اس خبر کو سُن کر بھونچکی سی رہ گئی۔ بہت دیر چپ رہنے کے بعد بولی۔ "مگر ڈیڈی نے تو مجھ سے وعدہ کر لیا تھا!"

رمیش کچھ نہ بولا۔ اس نے سروج کے منہ کو دیکھا۔ اسے ایسا لگا کہ اتنے دنوں سے وہ بات لاکھ کوششوں کے بعد بھی اُس کے دماغ میں نہ بٹھا سکا تھا۔ وہ آپ ہی آپ اس کے ذہن میں بیٹھ گئی ہے۔ اس کے چہرے پر عجیب قسم کی اداسی بکھر گئی تھی۔ رمیش طنز بھری ہنسی ہنس پڑا۔

سروج نے بھائی کی اُور دیکھا۔ مگر اس کی ہنسی میں شامل نہ ہو سکی۔ بلکہ وہ سوچ رہی تھی رمیش کو اس بات میں ہنسی کا کیا پہلو نظر آ گیا تھا۔

رمیش کو شنکر دادا کا گھر دیکھ کر کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی کیونکہ وہ اس قسم کے گھر نہ صرف دیکھ چکا تھا بلکہ ان میں رہ بھی چکا تھا، ان میں کھا بھی چکا تھا۔ سو بھی چکا تھا۔ مگر سروج ہر چیز کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

سوہنا حیرت کی تصویر بنی سروج اور رمیش کو دیکھ رہی تھی، سروج نے اُس وقت سر سے رومال کھول کر گلے میں باندھ لیا تھا۔ گہرے نیلے رنگ کے رومال کے اوپر اس کا چہرہ بہت گورا اور جاذب نظر لگ رہا تھا۔ سوہنیا کی نگاہ سروج سے ہٹ کر رمیش پر جم گئی اور اس کے دھول سے اٹے بال، چھریرا لمبا بدن اور سفید لباس، یہ چیزیں سوہنیا کو بھلی لگی ہوں یا نہ لگی ہوں مگر اس کا دل جیسے رمیش کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔

جب شمبھو نے الگ لے جاکر گوری کو دھیرے دھیرے بتایا کہ یہ زمیندار جی کے بیٹا بیٹی ہیں تو گوری بول اٹھی۔

"میں ان سے اپنی بچھیا مانگوں گی ـــ میری موتی۔"

مگر شمبھو نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔" پاگل نہ بن گوری، کیا مجھے جیل کھانا بھجوائے گی؟ جل پان تو کرایا نہیں اُلٹا جھگڑا کھڑا کرنے لگی۔"

میری جوتی کرائے جل پان جس..... شمبھو باہر نکل گیا۔ گوری پر اس کا بس نہ چلتا تھا۔ جب سے بچھیا اور موتی زمیندار جی کے گھر بندھ گئی تھیں، اس نے سوہنیا کو پکارا مگر جیسے اس نے سنا ہی نہیں وہ ٹکٹکی باندھے رمیش کو دیکھے جا رہی تھی۔

شمبھو سامنے آکر بولا۔" ارے سوہنیا، یہ زمیندار جی کے بیٹے ہیں، یہ بیٹی ہیں، کچھ جل پان کرائے گی یا کھڑی ہے منہ تاکتے۔"

"ہائے بھگوان، زمیندار جی کے بیٹے! وہ گھبراہٹ سے چلائی اور اکدم اندر بھاگ گئی۔

رمیش کا دل سوہنیا کی اس حرکت سے جیسے بیٹھ گیا..... یہ لوگ زمیندار کے نام سے کتنا ڈرتے ہیں!

اُس نے یوں ہی ٹوہ لینے کے لئے لچھمی کو پاس بلایا۔"زمیندار جی کے گھر چلو گی؟"

اُس نے بڑی بیباکی سے سر ہلا دیا۔" اونہوں۔"

"کیوں بھلا؟" سروج نے پوچھا۔

"باپو کہتا ہے زمیندار کسائی ہے۔ ہماری گائے بچھیا چھین لے گا۔"

سروج کٹ کے رہ گئی۔ رمیش نے سروج کو دیکھا جو سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی ـــ (تمہارے ڈیڈی کتنے انصاف پسند ہیں کہ لوگ انھیں قصائی کہتے ہیں!)

شمبھو ہاتھ جوڑتا آیا۔ "بجو! ہم گریب آدمی ہیں آپ کی کیا سیوا کر سکتے ہیں؟ بجور ہمارا مان رکھنے کو کچھ نہیں تو کھالی دو گراس[1] اٹھالیں۔"

موٹی موٹی دو روٹیاں اور تر دھنے کا ساگ تھا۔ رمیش نے خود ہاتھ دھو کر سروج کے بھی ہاتھ دھلائے اور بڑے مزے سے کھانا شروع کر دیا۔ مگر سروج پہلا نوالہ ہی نہ نگل سکی۔ وہ حیرت سے رمیش کو دیکھ رہی تھی کہ کیسا ہے، مریضوں کی طرح ایسے بد مزہ کھانے پر ٹوٹ پڑا ہے۔

"سوہنیا بھانپ گئی" دردناک مسکراہٹ سے بولی۔ "مالکن ہم بہت گریب ہیں" سروج بوکھلا کر بولی۔ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ کھا تو رہی ہوں" اور وہ سنبھل کر نوالے اٹھانے لگی۔

رمیش اور سروج واپس چلے تو شمبھو اور سوہنیا دور تک چھوڑنے آئے۔ سروج رمیش سے راستے میں بولی۔ "تم نے ایک بات محسوس کی؟ سب نے ہم سے بات کی مگر سوہنیا کی ماں ملی تک بھی نہیں ہم سے۔ حالانکہ میں نے سوہنیا سے پوچھا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ اندر بیٹھی ہے۔"

"مجھے کوئی تعجب نہیں ہے اس بات پر" رمیش متانت سے بولا۔

"وہ کیوں؟" سروج حیرت سے بولی۔

"شمبھو دادا کی بیوی کو معلوم ہے کہ بھیا زمیندار نے چھین لی ہے۔ اور ہم کوئی دوسرے نہیں۔ اسی زمیندار کی اولاد ہیں نا۔ بھلا ہمارا منہ دیکھنا کیوں پسند کرے گی ـــــ؟" پھر شمبھو سے بولا۔

---

[1] نوالے

" ارے دادا بہت دور آگئے اب چلے جاؤ "

سوہنیا نے خاموش آنکھوں سے رمیش کو دیکھا۔ رمیش گھبرا سا گیا۔

" بہت دور آ گئے سوہنیا اب چلے جاؤ تم لوگ " اس نے بوکھلاہٹ میں وہی جملہ

پھر دہرایا۔

" آپ لوگ گھوڑے پر بیٹھ جائیے۔ ہم ابھی چلے جائیں گے۔ اور جانا بھی کہاں ہے۔

یہیں کھیت میں کچھ کام کرنا ہے "

دونوں اچک کر گھوڑوں پر بیٹھ گئے۔ سوہنیا باپ سے بولی۔

" بابو! مجھے تو چھوٹے سرکار کچھ بڑے آدمی نہیں معلوم ہوتے "

شمبھو ابھی تک رمیش اور سروج ہی کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے چونک کر بولا۔

" ہاں ۔ ہاں ۔ بڑے آدمیوں میں بھی سبھی تو خراب نہیں ہوتے "

رمیش نے پلٹ کر دیکھا، باپ بیٹی دھیرے دھیرے واپس ہو رہے تھے۔

" کتنے غریب لوگ ہیں بیچارے۔ سوہنیا کی ساڑی کتنی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی "

سروج اپنی ہی فکر میں غلطاں پیچاں تھی۔ تھوڑی دیر بعد چونک کر بولی " تم مجھ

سے کچھ کہہ رہے تھے رمیش "

" تم کس خیال میں کھوئی ہو؟ " رمیش ہنس کر بولا۔ " کھانا بہت بد مزہ لگا کیا؟

میں تو کئی بار کھا چکا ہوں ایسا کھانا۔ ایسا کچھ برا نہیں ہوتا ہے۔ اصل میں تم نے کبھی

کھایا ہی نہیں۔ خیر رفتہ رفتہ جس چیز کی عادت ......

" رمیش! " سروج اس کی بات کاٹ کر ناگواری سے بولی " میں کھانے کے بارے

میں نہیں سوچ رہی تھی کچھ بھی۔ مجھے سارا غصہ ڈیڈی پر آ رہا ہے۔ مجھ سے وعدہ کر کے

بھی پیا کیوں نہیں دی انھوں نے شمبھو دادا کی۔

اتنی سی بات پر اتنا غصہ اور اتنی فکر ہا" اور وہ معنی خیز نگاہوں سے سروج کو دیکھنے لگا۔

"اتنی سی بات ہے یہ؟ سروج چلائی۔" زمیندار کا نام سُن کر ڈر جانا، زمیندار کی اولاد کو دیکھ کر گھر میں چھپ جانا۔ مارے نفرت کے ہم سے آنکھیں نہ ملانا۔ یہ سب اتنی سی بات ہے۔ شمبھو دادا کی بیوی ہم سے ملی تک نہیں اور تم اسے اتنی سی بات کہتے ہو؟ اگر وہ ڈیڈی کا نام سُن کر خوش ہو جاتے، ڈیڈی کے بچّوں سے ملنے دیوانہ وار آگے بڑھتے۔ تو یہ ڈیڈی کی کتنی بڑی فتح تھی کہ وہ اپنی پرجا میں اتنے چاہے جاتے ہیں کہ لوگ اُن سے، اُن کے بچّوں سے ملنے کو بیتاب ہو کر بھاگتے آتے ہیں۔ مجھے آج پتہ چلا ہے کہ ہم میں اور اُن میں بہت بڑا فاصلہ ہے۔ بہت بڑی خلیج ہے۔ ہمیں اس خلیج کو عبور کرنا ہی ہوگا۔ ان فاصلوں کو طے کرنا ہی ہوگا۔ سوال ایک گائے اور ایک بچھیا کا نہیں ہے بلکہ ——"

سروج کا منہ تمتما رہا تھا اور وہ یکساں بکے جا رہی تھی۔ رمیش گھوڑے پر بیٹھا ہولے ہولے مسکرا رہا تھا ——

وہ گہرے سرخ رنگ کے پھولوں کی ہلکی پھلکی ریشمی ساڑی پہنے۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی بڑے کمرہ میں داخل ہوئی۔ اور جا کر ایک کرسی کھینچ کر ڈیڈی کے مقابل بیٹھ گئی۔ رمیش اور ممی اُس کے داہنے بازو بیٹھے ہوئے تھے۔ کھانا بالکل خاموشی سے کھایا جا رہا تھا۔ ایکدم سے زمیندار صاحب بولے "ارے سروج! کیا بات ہے آج تم اور رمیش بالکل نہیں لڑ رہے ہو؟"

اُن کی بیگم نے تائید کی "ہاں دونوں گم سُم سے ہیں۔"

"اب ہم لڑنے کے لئے بچے نہیں رہے ڈیڈی۔" وہ ہاتھ روک کر بڑی سنجیدگی سے بولی۔

"ہو۔ہو۔ہو ۔۔۔" ڈیڈی بڑا بھاری قہقہہ لگا کر بولے "یہ احساس کب سے پیدا ہو گیا ہماری بیٹی میں؟"

"آج ہی پیدا ہوا ہے۔" وہ غصّہ کے مارے اٹھ کھڑی ہوئی ہے "ڈیڈی! اپنے وعدہ کرنے کے باوجود بھی شمبو دادا کی بچھیا انہیں واپس نہیں کی ۔۔۔ یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا"

"زمیندار صاحب بھی سنجیدہ ہو گئے۔ "تمہیں کیونکر معلوم ہوا؟"

"مجھے کیسے بھی پتہ چل گیا۔ مگر آپ نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا نا؟"

"وہ ہماری حماقت تھی اور زمینداری حماقتوں کے سہارے نہیں چلا کرتی"

"اگر میری حماقت تھی تو آپ کا فرض تھا کہ مجھے آگاہ کر دیتے۔ وعدہ کیوں کیا تھا آپ نے"

"ڈیڈی! پوجا میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں؟" دفعتاً رمیش نے پوچھا۔

ڈیڈی اپنی بیٹی کے بدلے ہوئے رویئے سے جز بز ہو رہے تھے۔ کچھ نہ بولے۔ ممی نے جواب دیا۔ "ان ہی دو ایک ہفتوں میں ہونے والی ہے"

"بہت خرچہ آتا ہے کیا پوجا پر؟"

"ہاں بیٹا! ہزاروں روپیہ اٹھ جاتا ہے۔ بڑی مصیبت کے بعد جمع ہوتا ہے یہ روپیہ!"

وہ حد درجہ ہیڑھے پن سے بولا "آپ لوگوں کو کاہے کی مصیبت۔ پیسہ تو کسان اور گاؤں والوں سے ہی وصول کیا جاتا ہے نا؟"

(بچے آج کیسی اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہے ہیں)

ممی مسکرائیں۔ "وصول کرنا بھی تو ایک مصیبت ہے۔ کم بخت ہزار بہانے تو بناتے ہیں۔"

"مگر بیچاروں کے بہانوں سے بھی تو کام نہیں چلتا۔ اُن کے جانور وصول کر لئے جاتے ہیں۔ کیوں ممی؟"

زمیندار صاحب چپ نہ رہ سکے (غصّہ) "نے اپنے بیٹے اور بیٹی کو اس روپ میں آج ہی

دیکھا تھا۔ وہ دونوں کو بیحد گھمنڈ سے اور بات بات پر جھگڑ بیٹھنے اور دوسرے ہی لمحے صلح کر لینے والے بچے سمجھتے تھے۔ بولے۔

"معلوم ہوتا ہے دونوں بھائی بہن سازش کر کے بیٹھے ہیں آج۔"

سروج جواب تک چپ بیٹھی تھی، بول اٹھی۔ "سازش نہیں ہے، سیدھی سادی سی بات ہے شمبھو دادا کی بچھیا انہیں دے دیجئے۔ ایسا ہی ہے تو شمبھو دادا کی طرف سے میں اپنی پاکٹ منی سے پوجا کا مان دے دوں گی۔"

ڈیڈی کڑوے لہجے میں بولے۔ "اور تمہیں پاکٹ منی کون دیتا ہے؟" سروج ہونٹ کاٹنے لگی۔

رمیش کہہ رہا تھا۔ "اور ممی میں نے سنا ہے کہ گو کسانوں اور گاؤں والوں سے پیسہ وصول کر کے پوجا کا اہتمام کیا جاتا ہے مگر وہ خود مندر کے باہر ہی کھڑے رہ کر پرشاد لیتے ہیں، اندر قدم بھی نہیں دھر سکتے۔ پوجا کرنے کا حق صرف پنڈتوں اور برہمنوں کو حاصل ہے۔ شاید بھگوان نے یہی کہا ہے کہ امیر تو مندر کے اندر بیٹھ کر پوجا کریں اور غریب مندر میں داخل بھی نہ ہو سکیں۔"

"رمیش —— !" زمیندار جی گرجے۔ "تم فضول بک بک کر رہے ہو۔"

"یہ بک بک نہیں ہے ڈیڈی!" وہ نرم لہجے میں بولا۔ "اگر آپ میری بات ذرا ٹھنڈے دل ......"

مگر انھوں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "شہروں کی ہوا میں اتنا کہ تم بڑے نکال رہے ہو۔ مگر مجھے اتنا بے وقوف نہ سمجھو کہ تمہاری باتوں میں آ جاؤں گا۔ بڑے چھوٹے کا فرق بھگوان نے لگایا ہے۔ ہمارا اپنا بنایا ہوا نہیں ہے۔"

"مجھے اتنا بتا دیجئے کون شاستر کہتا ہے کہ غریبوں سے دباؤ ڈال کر ظلم ڈھا کر

پوجا کا مان لو اور انھیں پوجا کرنے سے مندر سے باہر ڈھکیل دو۔"

"تو یوں کہئے صاحبزادے کمیونسٹ ہو گئے ہیں۔"

"رمیش بے باکی سے ہنسا۔" میں جانتا تھا آپ یہی کہیں گے۔

"اور میں بھی جانتا تھا کہ آج نہیں تو کل کبھی نہ کبھی تم یہ ذکر ضرور چھیڑو گے کسانوں سے تمہاری یہ ہمدردی۔ نیچ لوگوں سے تمہاری میٹھی میٹھی باتیں۔ رات دن غریب کسانوں کے گھروں اور کھیتوں کے پھیرے۔ میں جانتا ہوں تم پر کون سا بھوت سوار ہے۔ مگر کان کھول کے سُن لو۔ میں نے جائداد اس لئے نہیں پیدا کی ہے کہ یوں غریبوں پر لُٹا دوں۔ میں نے پڑھ لکھ کر قانون سیکھ کر اپنی جائداد دشمنوں کے ہاتھوں سے اس لئے نہیں کھینچی کہ کسانوں کو اس کا مالک بنا دوں۔ آج میں مقدمے لڑ لڑ کر اپنی جائداد حاصل نہ کرتا تو میں بھی دیکھتا کہ کس برتے پر چھوٹے سرکار کہلاتے۔ یہ میری جوتیوں کا ہی طفیل ہے صاحبزادے۔ محنت کا گاڑھا پسینہ ٹپکا کر کماؤ گے تب جانو گے پیسہ کیسے پیدا ہوتا ہے۔ خالی خولی ہوم مار کے غریبوں کا ہمدرد بن جانا سبھی کو آتا ہے۔"

"وہ متانت سے بولا۔" ڈیڈی یہ آپ کی غلط فہمی ہے، مجھے پیسے سے کوئی لگاؤ نہیں۔ اور یہ "چھوٹے سرکار" کا لیبل مجھے اپنے ماتھے پر جلتا انگارہ محسوس ہوتا ہے۔"

"میری غلط فہمی ہے! کیا خوب۔ اگر آج دانہ پانی بند کر دوں تو چھٹیں بول اٹھو گے۔ پھر نہ کہہ سکو گے مجھے پیسے سے کوئی لگاؤ نہیں۔"

"میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں دوبارہ پھر کہتا ہوں کہ مجھے پیسے سے کوئی لگاؤ نہیں۔ دنیا میں سارا جھگڑا پیسے کا ہے۔ ایسی چیز سے پیار کرنا میرے لئے عذاب سے کم نہیں۔ ویسے آپ جو چاہیں سمجھتے رہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو سُن لو کہ میں اپنی جائداد سے تمہیں ایک پائی بھی نہیں دوں گا۔"

رمیش نے اپنے مضبوط بازو ہوا میں پھیلا دیئے ۔ " یہ بازو سلامت رہیں پیسہ کیا چیز ہے ۔ آتا جاتا رہتا ہے ۔"

" بھیا! سروج دھیرے سے بولی ۔ " پاگل نہ بنو ۔"

" اب منانے سے کچھ نہیں بنے گا ۔ میں اس کم بخت کو اپنی جائداد سے پھوٹی کوڑی بھی نہ دوں گا ۔"

" سروج! ڈیڈی کو غلط فہمی میں مت مبتلا کرو ۔ میں پاگل پن نہیں کر رہا ہوں ۔ میں اپنے حواس میں ہوں ۔" پھر وہ زمیندار صاحب سے مخاطب ہوا ۔ " ڈیڈی غصہ میں آپ چاہے کچھ بھی کہیئے ۔ مگر مجھے امید ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی سنبھل ہی جائیں گے ۔ چھوٹائی بڑائی کوئی چیز نہیں ۔ آپ خود دیکھ لیں گے ۔"

مگر ڈیڈی برس پڑے ۔ " ہاں ہاں مجھے ہی تعلیم دینے چلے ہو ۔۔۔ ڈیڈی کبھی نہ کبھی سنبھل ہی جائیں گے ۔۔۔ نیچ لوگوں کو مندر میں گھسا لو صاحب زادے بڑے خوش ۔۔۔ نامعقول کو پڑھا لکھا کر اسی لئے اس لائق کیا کہ آج اپنے باپ پر انگلی اٹھائیں ۔ بڑے تیس مار خاں بنے پھرتے ہیں ۔ اور یہ بالشت بھر کی چھوکری بھی اس لونڈے کی ہاں میں ہاں ملانے چلی ہے ۔ دیکھوں گا دونوں بہن بھائی مل کر کون سی مساوات قائم کرنے چلے ہیں ۔ ساری اکڑ میرے پیسے پر ہے ۔ لوگ اس لئے اولاد کی خواہش کرتے ہیں کہ بڑھاپے میں لاٹھی کا کام دینے کی بجائے الٹا وبالِ جان بن جائیں ۔۔۔"؟

اور زمیندار جی بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئے ۔

پوجا میں بہت تھوڑے دن باقی رہ گئے تھے ۔ رمیش دن دن بھر کسانوں کی طرف رہتا ۔

جہاں مہتو چمار، گنگو کہار اور دوسرے نیچ نیچ دھیڑوں، بجاروں کی کانفرنس ہوتی رہتیں۔ رمیش ان سب کو بہت بندھاتا تھا۔ "تم نے پوجا کا مان دیا ہے تو کیوں نہ مندر کے اندر جا کر پوجا کرو۔" مگر لوگ ڈرتے تھے۔ شمبھو دادا اپنی سفید سفید مونچھیں ہلا کر ہاتھ جوڑتے "چھوٹے سرکار گریبوں کو اور برباد نہ کرو۔ ہمارا ابکے پانی بھی بند ہو جائیگا تو بھوکوں ہی مر جائیگا پورا خاندان۔ مگر رمیش ان کی عاجزی کو نظر انداز کر دیتا۔ سب کسانوں میں نیچ ذاتوں میں گھومتا۔ اسے پتہ چلا کہ سال کے سال بڑے زوروں پہ پوجا ہوتی ہے۔ ہر قسم کی سختی کے ساتھ پوجا کا مان حاصل کیا جاتا ہے۔ مگر پوجا کے دن انھیں مندر میں پھٹکنے بھی نہیں دیا جاتا۔

"اب کے سال ہم سب ساتھ ساتھ پوجا چڑھائیں گے۔ کیوں رامو کاکا؟" رمیش ہنس کر بولا۔

"ارے کا بات کرتے ہو چھوٹے سرکار۔ آپ اونچی ذات کے آدمی ہم نیچ اوپر سے گریب۔ ہمارا کون ٹھکانا؟"

رمیش بول اٹھا۔ "ایسا نہ کہو کاکا، ہم اونچ نہ تم نیچ، سب بھگوان کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ کیوں شمبھو دادا؟"

شمبھو دادا اس ناقابلِ یقین کو سُن کر ہنس پڑے۔ شیو جی کے مندر میں ان کے قدم پڑیں ۔۔۔!! یہ بات ہی مضحکہ خیز تھی۔

سوہنیاں ہنس کر بولی۔ "پار سال ہم پوجا کے بکھت مندر گئے تھے تو پجاری جی نے ایسا بول کے ڈھکیل دیئے تھے کہ تم نیچ ہو کلجگ لوگ ہو۔ کرشن بھگوان کلجگ لوگوں کی پوجا کبول نہیں کرتے۔" اس کی ہنسی میں درد بھرا ہوا تھا۔

رمیش تڑپ اٹھا۔ "اگر تم پوجا کا مان دیتے ہو تو کوئی بات نہیں کہ پوجا نہ کر سکو۔

دیکھو پرسوں ہی تمہیں مندر میں لے چلتے ہیں ہم۔ اور کبھی اگر مان نہ دو تب بھی مندر تو بھگوان کا ہوتا ہے۔ کسی انسان کا حق تو نہیں ہوتا اُس پر۔ اس میں امیر غریب سبھی جا سکتے ہیں۔ کسی ایک کی جاگیر تو نہیں ہے وہ؟"

آج شیام نگر میں سب سے بڑے مندر میں بڑی دھوم دھام تھی۔ گاؤں بھر میں ہنڈولے اور مشعل جل رہے تھے۔ زمیندار جی کے زیر اہتمام یہ سارے کام ہوتے تھے۔ آج وہ بڑے خائف خائف سے نظر آرہے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ رمیش تمام نیچ لوگوں کو سمیٹ کر آج پوجا کرنے آنے والا ہے۔ اور یہی موقع گاؤں کی تاریخ میں ایسا ہوتا ہے۔ جب سر پھٹول ہو جاتی ہے۔ لاٹھیاں چل جاتی ہیں اور جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ اور رمیش پھر بھی اُن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اور انھیں معلوم تھا کہ ان کا اکلوتا بیٹا کتنا ضدی اور ہٹیلا تھا۔ ایک طرف مندر اور دھرم کا سوال تھا۔ دوسری طرف پدری محبت۔

مندر کے سنکھ اور گھنٹیاں بج اٹھیں، پجاری، پنڈت، برہمن مندر میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک طرف بڑے لوگ، اونچی ذات کے لوگ صاف ستھری دھوتیاں پہنے ماتھے پر ٹیکے لگائے براجمان تھے۔ دوسری طرف عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ بھجن گائے جا رہے تھے۔ فضا میں پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ سب ساکت و صامت بیٹھے ہوئے تھے۔ سب کے دلوں میں بھگوان کی لو لگی ہوئی تھی۔ ایکدم باہر کچھ شور ہوا۔ پھر شور بڑھا اور کسی نے اونچی آواز سے کہا۔

"گاؤں کے نیچ لوگ آئے ہیں۔ مندر میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔"

اونچی ذات کے لوگوں میں بجلی دوڑ گئی۔ مار ہٹاؤ پیچھے۔ بھگوان کا گھر ہے۔ مذاق نہیں ہے

کیا اپنے غلیظ قدموں سے بھرشٹ کرنا ہے مندر کو؟ ــــ"

سامنے ہی رمیش کھڑا تھا۔ "بھگوان کسی ایک کا نہیں ہے، سب کا ہے بھگوان نے کوئی فرق نہیں لگایا۔ انھیں اندر کیوں نہیں آنے دیا جاتا؟ ــــ پھر ــــ"

چھوٹے سرکار کے آگے کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ "آپ لوگ اندر کیوں نہیں داخل ہو جاتے؟" رمیش پکارا۔ کوئی بھی آگے نہ بڑھا۔ سب کے دل خوف سے ڈانوا ڈول ہو رہے تھے۔ پیروں میں زنجیریں سی پڑ گئی تھیں۔

"کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ آپ لوگ آگے کیوں نہیں بڑھتے ــــ راموکا کا ــــ شمبھو دادا ــــ سوہنیا ــــ کاکی ــــ کیا آپ لوگ پوجا نہیں کرنا چاہتے؟"

سوہنیا کے پیروں کو جنبش ہوئی، اس کے بدن سے سفید ساڑی لپٹی ہوئی تھی۔ سر کے بالوں میں تیل پڑا ہوا تھا۔ آنکھوں میں کاجل تھا اور ہتھیلیوں میں پوجا کی تھالی۔ وہ آج بڑے اہتمام اور سنگار کے ساتھ پوجا کرنے آئی تھی ــــ اس نے ایک قدم اٹھایا ــــ دوسرا، تیسرا، ــــ اور پھر اس کا پیر مندر کی چوکھٹ پر پڑا مگر اسی سمے کسی نے دھکیل دیا۔ "نیچ چمارن ــــ گھستی چلی آ رہی ہے مندر میں پوجا کی تھالی چھین سے زمین پر آ پڑی۔

رمیش چیخا ــــ "یہ سوہنیا کو کس نے دھکیلا۔" پھر مڑ کر چلایا۔ "ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ آیئے آپ لوگ ــــ قدم اٹھایئے۔ آج پوجا کی خاطر جان کی بھی بازی لگا دینی پڑے تو بھی پرواہ نہ کیجئے۔"

اور گویا کسی نے ان کے دلوں میں غیبی طاقت بھر دی ہو۔ سب کے قدم اٹھنے لگے۔ مندر میں کوئی گھبرا کر چیخا۔ "ارے سارا مندر گندہ ہو جا رہا ہے۔ دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔ ارے کوئی اپائے کرو۔"

زمیندار جی سامنے ہی کھڑے ہوئے تھے ـــ پنچ لوگ مندر میں گھسے چلے آرہے تھے۔ یہ ان کی کتنی بڑی شکست تھی کہ ان کے کرم پر جینے والے، ان کے قدموں پر سر جھکانے والے آج اُن سے ہار ماننے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ اور جان کی بازی لگا کر پوجا کرنے پر تُل گئے تھے۔ انہوں نے گرجدار آواز سے کہا۔

"سر توڑ دو آنے والوں کا۔ مار بھگاؤ کمبختوں کو۔ لاٹھیاں برسا دو اِن کے سروں پر۔ ساری ذمّہ داری میرے کاندھوں پر ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

سامنے ہی رمیش کھڑا تھا ـــ باپ بیٹے کی نظریں ملیں مگر دوسرے ہی لمحے رمیش نگاہیں چرا کر پھر کہہ رہا تھا۔ "ڈرنے کا مقام نہیں ہے۔ مندر میں داخل ہو جاؤ ـــ آج بہر صورت پوجا کرنی ہے۔ پوجا کے مان میں اپنا خون بھی شامل کر دو۔"

زمیندار جی کی اجازت پا کر گویا پجاریوں، برہمنوں اور پنڈتوں کو منہ مانگی مراد مل گئی۔ جس کے ہاتھ میں جو آیا اسی سے پنچ لوگوں کی تواضع ہونے لگی۔ پجاریوں کے بھوجن پکنے کے لئے جو ایندھن آیا رکھا تھا اس سے پنچ لوگوں کے سر توڑنے کا مبارک فرض انجام دینے لگے۔ لاٹھیاں ـــ ڈنڈے ـــ پتھر ـــ سروں پر ـــ ہاتھوں پر ـــ بازوؤں پر، اور پیروں پر پڑ رہی تھیں۔ کہ ایک بھرپور لاٹھی رمیش کے سر پر پڑی۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا کہ ایک پتھر زور سے کنپٹی پر آ لگا۔ ایک بھرپور ایک بھرپور ہاتھ پیٹھ پر پڑا۔ اور رمیش تیورا کر گر پڑا۔ لوگ زخمی ہو ہو کر گر رہے تھے۔ کوئی اپنے پورے وزن کے ساتھ رمیش کے سر پر آن پڑا۔ تھوڑی دیر کے لئے رمیش کو ایسا محسوس ہوا گویا اس کا سر پچک کر رہ گیا ہو۔ وہ درد سے کراہا۔ اس کے سر سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔ کنپٹی کے پاس خون جھر جھر بہہ رہا تھا۔ "ارے یہ تو چھوٹے سرکار ہیں؟" کوئی چلّایا۔

لوگوں میں بدحواسی پھیل گئی تھی۔ رمیش اپنے حواس کھو رہا تھا۔ لاٹھی بہت زور سے پڑی تھی۔ اس کا سر چٹخ گیا تھا۔ ایکدم سے سوہنیا لپکی۔ بے خبری میں وہ مندر کی چوکھٹ کو پھلانگ گئی۔ رمیش مندر کے احاطہ میں گر پڑا تھا۔ اس نے رمیش کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ دھول سے اٹے ہوئے وہ بال جنھیں وہ بہت محویت سے دیکھ رہی تھی۔ اب خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔ معصوم اور خوبصورت چہرے پر خون جم رہا تھا۔

"چھوٹے سرکار" وہ دل کا سارا درد ضبط کر کے پکاری۔

رمیش نے آنکھیں کھولیں۔ بڑی مشکل سے مسکرا کر بولا "تم مندر میں داخل ہو ہی گئیں۔ سوہنیا!"

اسی سمے زمیندار جی لپکے ہوئے آئے۔ رمیش کو خون میں نہایا دیکھ کر ان کی محبت پگھل گئی۔ محبت کی اس پکار کے آگے دھرم کی وہ لگن جس کے لئے یہ چاند سا مکھڑا خون میں نہا گیا تھا۔ اب دل کے کسی کونے میں روپوش ہو گئی تھی۔ وہاں اب دھرم اور اونچ نیچ کا سوال نہ تھا۔

انھوں نے سوہنیا کی گود سے اٹھا کر رمیش کا سر اپنی گود میں اٹھا لیا۔ میرے بچے! میرے رمیش! ان کی آواز کانپ رہی تھی۔ زمیندارنی جی سراسیمہ ہو کر ننگے سر دوڑ پڑی تھیں۔ اور رمیش کے خون سے لتھڑے ہوئے منہ کو بے تحاشا چوم رہی تھیں۔ سروج کی تھالی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گری تھی۔ دودھ جیسی سفید ساڑی کا آنچل اس کے ماتھے پر لہرا رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں کھلی تھیں۔ ان میں آنسو نہیں تھے۔ خوف بھی نہیں تھا۔ مسکراہٹ بھی نہیں تھی نامعلوم سی وحشت برس رہی تھی۔

پجاری، برہمن، پنڈت سب چپ چاپ کھڑے تھے۔ مندر کے صحن میں اور بھی کوئی پانچ زخمی ہو کر گر پڑے تھے کسی کے سر سے خون نکل رہا تھا کسی کا ماتھا پھٹ گیا تھا

کوئی بیہوش ہوگیا تھا۔ کوئی زور سے چلا رہا تھا اور زمیندار جی کی بوڑھی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ ان کی سفید مونچھیں کانپ رہی تھیں۔ زمیندارنی جی بین کر رہی تھیں۔ "میرے لال! یہ تیرا جوان جوان گرم گرم جیتا لہو۔ ہائے جن آنکھوں سے یہ خون دکھائی دے رہا ہے وہ اندھی کیوں نہ ہوگئیں۔ ہائے یہ لاٹھیاں یہ پتھر مجھ پر کیوں نہ برس گئے۔ ہائے میری کوکھ اجڑ گئی۔

بھجن رک گئے۔ مندر پر باد جود کراہوں اور سسکیوں کے ایک سناٹا سا چھا گیا تھا۔ رمیش نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ دھیرے دھیرے اس کے ہونٹ کانپے۔ "ڈیڈی! میں بھی تو..... مندر..... میں پوجا کرتا ہوں..... یہ خون میرا مان..... ہے..... مگر ڈیڈی..... شمبھو دادا کی پوجا..... نہیں بھی تو پوجا کا حق....."

سروج کے ہونٹ بھنچ گئے ـــــ زمیندارنی جی کی چیخوں میں اضافہ ہوگیا۔ ایک دم زمیندار جی کھڑے ہوگئے۔ اُن کی آنکھیں برس رہی تھیں اور اُن کا درنی جسم خزاں کے سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ان کے چہرے پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اپنی پوری طاقت لگا کر بولے۔

"آپ سب لوگ مندر میں آجائیے اور پوجا کیجئے۔ یہ اپنی طرح کی ایک ہی پوجا ہوگی۔ یہاں کتنوں نے اپنا خون دیا۔ مگر میرے رمیش نے..... ..... "وہ بڑی مشکل سے بول پا رہے تھے۔" مگر میرے رمیش نے اپنا خون ہی نہیں دیا۔ بلکہ اپنے پران بھی دے دیئے۔ مجمع میں حرکت ہوئی اور ایکدم کئی لوگ اندر گھس پڑے۔

پجاری خاموش تھے ـــــ برہمن خاموش تھے ـــــ پنڈت خاموش تھے

—— زمیندار جی خاموش تھے —— پنچ لوگ دھیرے دھیرے بالک اور پوتر مندر میں داخل ہو رہے تھے۔ رمیش نے بڑی مشکل سے یہ سب دیکھا اور اس کے مرتے ہوئے ہونٹوں پر بڑی معصوم سی مسکراہٹ بکھر گئی ——

زمیندار جی تڑپ اٹھے۔ موٹے موٹے آنسوؤں کی کئی بوندیں ان کی آنکھوں سے چھلک پڑیں۔ وہ رمیش پر جھکے، اس کے خون آلودہ منہ کو چوم کے بڑی مشکل سے بولے۔

"رمیش بیٹا! —— میں آج ہی شمبھو کی گائے اور بچھیا اس کے گھر بھجوائے دیتا ہوں۔"

سوہنیا نے اٹھ کر مندر کی گھنٹیوں کو جھولا جھلا دیا اور پنچ لوگ زور زور سے بھجن گانے لگے۔

میں پھر آؤں گا

جنّت کا بڑا ہی روح پرور ماحول تھا۔ فضا خوابناک خوشنما ابر کے ٹکڑوں سے سہانے پن کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ہوائیں خوشبوؤں سے بوجھل تھیں۔ سارے میں ایک تقدّس پھیلا ہوا تھا۔ بھگوان اپنے استھان پر براجمان تھے۔ کہ دفعتاً ایک فرشتہ اپنے ریشمی پردوں کو سرسراتا، ادب سے سر جھکائے آیا اور بھگوان کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"کہو فرشتے کیا بات ہے"؟ بھگوان نے نرمی سے پوچھا۔

فرشتے نے سر نہیں اٹھایا کہ ادب اس کی اجازت اور ہمت نہیں دیتا تھا۔ سر جھکائے ہی جھکائے بولا۔

"انتریامی ـــــ وہ لنگوٹی والا ....." اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بھگوان بول اٹھے۔ "کیا ابھی تک اُس نے جنّتی لباس نہیں پہنا"؟

"جی نہیں بھگوان ـــــ بات وہ نہیں ہے۔ لباس تو جب سے وہ دنیا سے آیا ہے اس نے پہنا ہی نہیں اور کہتا ہے کبھی پہنوں گا بھی نہیں، تاوقتیکہ میرے سارے لوگوں کو تن بھر کپڑا میسّر نہ آجائے!"

"تو پھر کیا بات ہے ؟ وہ کھانا نہیں کھاتا ؟"
فرشتہ ادب سے بولا ___ " جی حضور کھانا بھی بس وہ یونہی سا کھاتا ہے، وہ بھی جو بہت ہی خراب قسم کا ہوتا ہے۔ یہاں بھی اس کا یہی کہنا ہے کہ جب تک اس کے لوگوں کو وہاں پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا میں نہ پیٹ بھر کھاؤں گا نہ اچھا کھاؤں گا"
پھر کیا بات ہے۔ بھگوان پریشانی سے بولے " کیا اُسے اپنے لوگوں کا خیال اور چنتا ستاتی ہے جو دوزخ میں ہیں " ؟؟
فرشتہ گڑبڑا کر بولا۔ " جی نہیں حضور یہ بھی بات نہیں۔ کیونکہ وہ لوگ تو دوزخ میں بے حد خوش ہیں "
" کیا بکتے ہو ___ ؟ بھگوان غصّے سے بولے دوزخ میں بھی کوئی خوش رہ سکتا ہے "
جی جی حضور، فرشتہ اٹک اٹک کر بولا۔ " وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم بھارت سے آئے ہیں۔ اس لئے یہاں دوزخ میں بے حد مزد ں میں ہیں "
" ہوں ___ تو یہ بات ہے۔ بھگوان ہنکارا بھر کر بولے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بھارت میں بے حد خراب حالات ہیں "
" جی، جی۔ فرشتہ خوش ہو کر بولا۔ یہی بات ہے حضور۔ اسی لئے تو وہ لنگوٹی والا وہاں جانا چاہتا ہے "
" وہاں جانا چاہتا ہے ___ !؟ بھگوان سخت تعجب سے بولے۔ " مگر کاہے کے لیے "
" جی حضور وہ چاہتا ہے کہ اسے تو یہاں جنّت میں رہتے تیس برس ہو چکے ہیں۔ وہ تو بہت آرام سے ہے لیکن اسے قطعاً ذہنی سکون نہیں ہے۔ اسی لئے ذرا دہ ایک نعرہ لگانا چاہتا ہے کہ وہاں کے حالات ذرا سدھار سکے "
" ارے جس بھارت کو ہم نہ سدھار سکے یہ دیوانہ کیا سدھارے گا۔

اس کی عقل تو ٹھکانے ہے۔"

"جی حضور عقل تو اس کی بے حد ٹھکانے ہے جبھی تو اس نے یہ سوال کیا ہے کیونکہ اُسے پتہ ہے کہ آپ بے حد نیک جنتیوں کی ۲۵ سال میں ایک خواہش، کوئی سی بھی خواہش ضرور پوری کرتے ہیں۔ اور اسے تو کم و بیش تیس سال ہو رہے ہیں۔" دفعتاً فرشتہ پیچھے مڑا۔ اور لنگوٹی والے سے مخاطب ہو کر ذرا مہذب سی سختی سے بولا۔

"ارے بابا تم بھی تو کچھ کہو، ورنہ بھگوان سوچیں گے کہ میں ہی خواہ مخواہ ٹرٹر کیے جا رہا ہوں۔"

لنگوٹی والے نے اپنا جھکا ہوا سر اُٹھایا۔ اس کا چہرہ غم و اندوہ کی تصویر بنا ہوا تھا۔ آنکھیں کبھی کبھی بے رونق تھیں، چہرے کا مجموعی تاثر یہ تھا کہ اب رویا کہ تب رویا ــــ وہ کچھ نہیں بولا۔

بھگوان ذرا بور ہو کر بولے ــــ "یہ تو کچھ کہتا ہی نہیں ہے۔"

"حضور مسلسل غموں نے اس کی طاقت گویائی چھین لی ہے۔ میں تو اس کی آنکھوں سے اس کے دل کی بات پڑھ لیتا ہوں۔"

"اسے بھارت کے حالات بتائے کس نے؟" بھگوان جز بز ہو کر بولے۔

"حضور ــــ فرشتہ ڈر کر بولا۔ بھارت سے آنے والے کچھ جنتیوں نے۔"

"وہ لوگ جنت میں ہیں اور پھر بھی تکالیف کے قصے اور حالات سناتے ہیں ــــ"؟؟ جنت میں آ کر تو انسان اپنا ماضی یکسر بھول جاتا ہے۔؟!

"جی حضور۔ وہ تو ٹھیک فرماتے ہیں آپ، لیکن بات یہ ہے حضور کہ آپ کا ہی ارشاد ہے کہ ایک انسان کو بار بار سزا نہیں دی جا سکتی۔ آج دنیا میں اُس نے دکھ

جھیلے ہیں تو لازماً جنّت ملے گی، اسی لئے اس لنگوٹی والے نے آنے والوں سے پوچھا تھا کہ تمھیں جنت اپنے نیک کرموں کی وجہ سے دی گئی یا دنیاوی سختیوں کی وجہ۔"

"تو انھوں نے کیا بتایا؟" ؟

"بس پوچھئے مت حضور۔ اُف سنا نہیں جاتا تھا حضور۔ پتہ نہیں آپ کیسی دنیا چلا رہے ہیں؟"

"کیا بکتے ہو" بھگوان گرجے۔

"معاف کیجئے حضور۔ اصل میں میں سیدھے سادے سبھاؤ میں کہہ گیا کیونکہ آپکے یہاں ایمرجنسی نہیں ہے اور کہنے سُننے کی آزادی ہے۔

"ایمرجنسی ــــ؟ بھگوان حیرت سے بولے۔ "یہ کیا بلا ہے؟"۔

فرشتے نے غیر متعلق سا جواب دیا ــــ "حضور اسی لئے تو یہ لنگوٹی والا بھارت کو جانا چاہتا ہے، وہاں کے حالات سخت بگڑے ہوئے ہیں۔"

"اچھا۔ بھگوان کے لہجے میں عجیب و غریب حیرت تھی ــــ" تم ایسا کرو فرشتے ذرا اُس کونے کی طرف آسمان کے اس جھروکے کے قریب جاؤ اور پردہ اٹھا کر ذرا جھانکو اور دیکھو کہ بھارت میں کیا ہو رہا ہے، اور ذرا ہمیں بھی بتاتے جاؤ۔"

آپ کو ــــ؟ فرشتہ حیرت سے بولا۔ آپ تو حضور انتریامی ہیں۔ آپ کو تو ہر بات کا علم رہتا ہے ــــ"!

"نہیں ہم تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں ــــ" اور ویسے بھی تم نے اس وقت ہمیں آپ سٹ کر دیا۔"

فرشتہ اپنے پروں کو سرسراتا ہوا جھروکے کے قریب پہونچا اور نیلی پرت اٹھا کر نیچے دیکھتے ہی گھبرا کر بولا۔ "بڑی سخت گڑبڑ ہے انتریامی۔"

"کیسی گڑبڑ ــــ؟ بھگوان کے لہجے میں تشویش تھی۔

بھارت میں تو مہابھارت چھڑی ہوئی ہے۔" نالائق فرشتے ــــ بھگوان چڑھ کر بولے ــــ "اتہاس سے تمہاری یہ غفلت تمہیں اس گدّی سے ہٹا کر ہی دم لے گی۔ تمہارے گیان کی وجہ ہم نے تمہیں یہ عہدہ دیا ہے اور تم اوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہو۔ مہابھارت کو چھڑے، ختم ہوئے تو یگ بیت گئے۔"

" یہ ویسی مہابھارت نہیں ہے حضور۔ یہاں تو نقشہ ہی کچھ اور ہے۔"

" نقشہ ــــ؟ بھگوان بے تابی سے بولے۔ ذرا کچھ بتاؤ تو سہی۔"

فرشتہ نیچے جھانکتے ہوئے بولا ــــ" میزوں پر کئی آدمی لیٹے ہوئے ہیں۔ گھبرائے ہوئے، پریشان کراہتے ہوئے، زبردستی پکڑ کر لائے ہوئے لوگ۔" مگر یہ لوگ لٹائے کیوں گئے ہیں۔ اور پکڑ کر کیوں لائے جا رہے ہیں۔"

فرشتہ شرما کر بولا۔" حضور ان کی نس بندی ہو رہی ہے۔"

"نس بندی ــــ؟ بھگوان چڑھ کر بولے۔ یہ نس بندی کیا ہوتی ہے؟"

جی۔ جی حضور ــــ فرشتہ بدستور شرما رہا تھا۔" ان کی ایک نس کاٹ دی جاتی ہے۔"

بھگوان چیخنے کے انداز سے غصّہ میں بولے۔" نس کاٹ دی جاتی ہے؟۔ لیکن کیوں؟ آخر کیوں ــــ فرشتے کیا ہم نے انسان کو ایک مکمل روپ میں دنیا میں نہیں اتارا تھا ــــ؟ پھر ہمارے ماڈل میں کمی بیشی کرنے والے یہ کون ہیں؟"

فرشتہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ انتریامی آپ کے ماڈل میں کمی بیشی نہیں کی جا رہی، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ آپ کا بندہ بچّے پیدا کرنے کے قابل بنایا جا رہا ہے۔"

بھگوان دہرے غصّہ سے بولے۔" ارے پاگلو ہم نے انسان کو نسل بڑھانے کے لئے ہی تو دنیا میں بھیجا تھا۔ ورنہ یہ دنیا اتنی خوبصورت کیسے بنتی؟"

"لیکن حضور آپ ذرا گڑبڑ کر رہے ہیں۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ بس بچے بہت ہو چکے۔ کھانے پینے کو بھی تو کچھ چاہیئے نا" ؟

" فرشتے "۔۔ ؟

"جی انتریامی" !

" یہ بتاؤ ۔۔ بارش کون برساتا ہے"؟

" جی انتریامی آپ "

" اناج کون اگاتا ہے" ؟

" جی انتریامی آپ "۔۔ ؟

" بچے کون پالتا ہے ۔" ؟

" جی انتریامی آپ ۔۔!"

" اور بچے پیدا کون کرتا ہے ۔" ؟

" جی انتریامی ۔۔ میرا تو ایمان ہے کہ آپ لیکن وہ لوگ کہتے ہیں کہ انسان "

" واقعی یہ لوگ حد سے آگے بڑھ گئے ہیں ۔بھگوان غصہ سے کانپ کر بولے۔ اچھا ذرا اور سناؤ کیا ہو رہا ہے ۔"

" حضور دنوں کو پلٹاؤں ذرا ۔ جیسے دنیا والے کیلنڈر پلٹاتے ہیں تاکہ آپ کو پیچھے کے بھی کچھ حالات بتا سکوں "۔

" اجازت ہے ۔"

" ارے ارے حضور " ستیاناس !

" کیا ہوا ۔" بھگوان گھبرا کر بولے ۔

گھر جلائے جا رہے ہیں۔ نہتے لوگوں پر گولیاں چلائی جا رہی ہیں" !

"لیکن کیوں۔؟"

"شہر صاف شفاف بنانے، خوبصورت دکھائی دینے کے لئے۔ اور سارے مکانات۔"

"فرشتہ نیچے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔" یہ سارے مکانات غریبوں کے ہیں۔ بے چارے کے مکانات بھی کیا۔ جھگیاں، جھونپڑیاں ہیں۔ اور انہی کو جلایا جارہا ہے۔"

"پھر شہر صاف ہوا۔"

"ارے سرکار غریب ہی صاف ہو گئے۔" فرشتہ ایک دم پلٹتا ہوا بولا۔

اُف۔" پیچ پیچ پیچ۔"

"اب کیا ہوا۔" بھگوان گھبرا کر بولے۔

"اسکول میں غریب بچّوں کو جو دودھ دیا جاتا ہے نا حضور۔ اس میں بالٹیوں پانی ملایا جارہا ہے۔"

بھگوان نے سخت تکلیف محسوس کی۔ بولے کچھ نہیں۔ فرشتہ ایک دم چلّایا۔ اور ماتھے پر ہاتھ مارنے لگا۔

"ارے بھگوان۔"

"بولتے کیوں نہیں۔" بھگوان چیخے۔

یہ اِدھر دیکھئے بھوکے، ننگے، غریب بیمار لوگ پیٹ جن کی پیٹھوں سے لگے ہوئے ہیں۔ دانے دانے کو ترس رہے ہیں۔ اور یہ اِدھر دیکھئے۔ بھنڈار کے بھنڈار اناج سے بھرے پڑے ہیں۔ دکانوں پر بورڈ لٹکے ہوئے ہیں" اسٹاک ختم" اور دیکھئے انتریامی اندر، اور اندر، گودام لدے بھرے پڑے ہیں۔ اور یہ دیکھئے حضور راشن کی دکانوں پر کتنی لمبی لمبی لائنیں لگی ہیں مگر لوگ خالی ہاتھ جارہے ہیں کیونکہ اسٹاک ختم کا بورڈ ہر دکان پر لٹک رہا ہے۔

بھگوان غصّے سے کانپ رہے تھے۔

" مگر یہ کون لوگ ہیں جو اتنے ظالم ہیں۔"

ان کے اپنے ہی والے ہیں حضور۔" انگریز تو چلے گئے لیکن....."

"لیکن کیا"۔۔۔؟ بھگوان نے تلخی سے پوچھا فرشتہ بھگوان کی بات سُنی اَن سُنی کرکے نیچے غور سے جھانکتا ہوا بولا۔

" بہت موٹے موٹے لوگ گھوم پھر رہے ہیں حضور۔ دھوتیاں پہنے ہوئے سفید سفید کرتوں والے۔ کوئی میٹنگ کا چکر ہے۔ موٹے موٹے گدّے بھی بچھے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ مُکّے مار مار کر اپنی بات منوانا چاہ رہے ہیں۔ کوئی صاحب ہیں عیسیٰ علیہ السلام ان کا بے حد ذکر ہے۔"

بھگوان نے غصّہ سے فرشتے کو گھورا تو وہ گڑبڑا کر بولا۔۔۔" جی نہیں حضور عیسیٰ علیہ السلام سے ان کا کوئی سمبندھ نہیں۔ وہ کچھ اندر باہر کرنے کا سلسلہ ہے۔ عیسیٰ صاحب کے ہاتھ میں۔

" فرشتے"۔۔۔ بھگوان نے رسان سے کہا۔" ہم نے تمھارے گیانی اور ودوان ہونے کی بنا ہی پہ پدوی تمھیں عنایت کی ہے، کیا تم یہاں بیٹھے بیٹھے پتہ نہیں چلا سکتے کہ یہ کیا بلا ہے؟

" جی نہیں حضور۔۔۔ فرشتہ ڈر کے مارے کانپتا ہوا بولا۔ مجھے ایسا آدیش نہ دیجئے میں بھی اندر کر دیا جاؤں گا۔"

بھگوان سُن ہو کر رہ گئے۔ فرشتہ پھر دیکھنے اور سُنانے لگا۔

" وہ دیکھئے موٹی موٹی توندوں والے لیڈر..... بھگوان بات کاٹ کر بولے۔

" ان کی توندیں اتنی موٹی ہو گئی ہیں تو یہ لوگ ڈائیٹنگ کیوں نہیں کرتے۔ کھانا کم کیوں

نہیں کر دیتے۔"

انتریامی۔ فرشتہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "یہ لوگ کھانا کھاتے ہی کہاں ہیں۔ یہ تو غریبوں کا خون پیتے ہیں، اس میں بہت وٹامن ہوتے ہیں سرکار، اسی لئے یہ اتنے موٹے ہیں۔"

ابھی بھگوان کچھ جواب دینے بھی نہ پائے تھے کہ فرشتہ چلّا کر بولا۔

"بسکٹ۔ حضور بسکٹ۔"

بھگوان غصہ سے بھنّا کر بولے "ہمیں سخت افسوس ہے فرشتے کہ تم جنت میں اعلیٰ سے اعلیٰ ہر چیز کھانے کے باوجود بھی اتنے ندیدے ہو کہ بسکٹ دیکھتے ہی اچھل پڑے۔"

ارے نہیں انتریامی۔ سونے کے بسکٹ۔ دیکھئے دیکھئے بڑے بڑے بکسوں میں بھرے ہوئے جگر مگر کرتے بسکٹ۔ یہ سب بسکٹ قلی بڑے بڑے سیٹھوں اور لیڈروں کے محلوں میں لے جا رہے ہیں۔ رات کا اندھیرا کتنا گہرا ہے۔ سرکار دیکھئے۔ لیکن آپ نے اپنی مہربانی سے ان آنکھوں میں وہ جوت بھر دی ہے کہ رات میں بھی دن کی طرح آر پار دکھائی دیتا ہے۔

فرشتہ سناٹے گیا۔ اندر دیکھئے حضور۔ نہیں پہلے باہر دیکھئے سڑکوں پر کچرے کے ڈھیر میں سے غریب غربا کھانے پینے کی چیزیں ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنے بچوں کو کھلا رہے ہیں اور خود کھا رہے ہیں۔ اور اندر

بالکل کسی ہندوستانی کاسٹیوم فلم کا منظر ہے۔ انتریامی دیکھئے بڑے بڑے نرم قالین ——— دیواروں پر دیوار تکیے، نرم نرم پردوں اور مخمل والے گاؤ تکیے، بیچ میں فانوس جگمگر کرتے ہوئے۔ محفل سجی ہوئی ہے۔ شراب چل رہی ہے حضور۔ جس کی آپ نے مناہی کر رکھی ہے مگر آپ کی سنتا ہی کون ہے، اور حضور بیچ میں تقریباً عریاں رقص ہو رہا ہے۔ فرشتہ شرما گیا۔ کیسے بے شرم لوگ ہیں، جوان لڑکی ناچ رہی ہے

اور سب دیکھ رہے ہیں ایک ساتھ۔ اور حضور دیکھئے صرف ایک جگہ ہی نہیں۔ یہاں وہاں کتنے شہروں میں یہی ایک منظر ہے"!

بھگوان چپ تھے۔ شاید غم کی شدت سے فرشتے نے ایک اور دن پلٹایا۔

"ارے حضور جنازہ۔ فرشتہ تڑپ کر بولا یعنی میّت"۔

"جنازہ — ؟ میّت"؟ کس کا جنازہ؟ کس کی میّت" بھگوان بے چینی سے بولے۔

ٹھہرئیے حضور ذرا۔ میں پڑھتا ہوں۔ ہاں حضور" اردو کا جنازہ"

بھگوان ذرا ناراضگی سے بولے۔ "لیکن ہم نے یم دوت کو جہاں تک ہماری یادداشت کا تعلق ہے کسی بھی اردو نامی انسان کے پران نکالنے کا آدیش نہیں دیا تھا"۔

فرشتہ ہنسا۔" انتریامی! اردو انسان نہیں۔ بولی ہے۔ زبان"۔

"زبان — ؟کیسی زبان۔ کیسی بولی"؟

"ایسی ہی حضور جیسی ہم اور آپ بول رہے ہیں یا اسی خاندان کی ایک تھی بیچاری"

"تھی۔؟" بھگوان پڑ کر بولے "تھی کا کیا مطلب؟" مطلب وہی ہے جو میں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ اودھ مری تو یہ بہت زمانے سے چلی آرہی تھی لیکن اب تو باقاعدہ اس کا جنازہ نکل گیا۔ بالکل ہی کھٹیا کھڑی کر دی بھائیوں نے"۔

اب ہر بات بھگوان کی برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔ چلّا کر بولے۔

"لیکن اتنا انیائے ہو رہا ہے تو وہاں راج کس کا ہے آخر؟"

فرشتہ ڈرتے ڈرتے بولا" جی انتریامی راج تو ایک ۲ سال کا بچہ کر رہا ہے وہاں۔"؟

کیا بکتے ہو فرشتے۔ بھگوان مزید غصّہ ہو کر بولے "کیا تمہاری عقل بالکل سٹھیا گئی ہے۔ اور تمہاری یادداشت اتنی کمزور ہو گئی ہے؟ یاد نہیں کہ ہم نے اب تک دنیا میں سب سے کم عمری میں بادشاہت اور راج صرف اکبر بادشاہ کو دیا تھا۔ اب یہ ۱۲ برس

کا راجہ کونسا جھپک گیا ؟
جی جی۔ انتریامی۔ بچھلے سال عمر کے زیادہ ہوں لیکن اس کی عقل تو دو ہی برس کے
بچے کی ہے۔ وہ ابھی تک بھی موٹر سے کھیلتا ہے حضور۔"
" اور اس کی ماں کیا کرتی رہتی ہے ...؟
" اس کی ماں روتی رہتی ہے حضور۔" !!
" ماں کیوں روتی ہے؟ بچے کو سنبھالنا چاہیئے۔ بہلانا چاہیئے یا اس کے ساتھ رونا چاہیئے۔"
" ماں کے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہے حضور۔"
" کیسی ٹریجڈی۔" بھگوان ذرا تجسس سے بولے۔
اصل میں لاڈ پیار میں اس نے بچے کو اتنا تباہ کر دیا کہ وہ کھیل کھیل میں کہیں بھی پہونچ جاتا۔ قلم اٹھا کر کسی بھی فائل میں دستخط کر دیتا۔ بس اس کے دستخط سے حکم چل جاتے۔ اب دو باتوں کی وجہ سے روتی ہے کہ ایک تو بچہ اس پر قابض ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ ہاتھ سے راج پاٹ نہ نکل جائے۔ اسی لئے پورے دیش میں ہاہا کار مچی ہے سرکار۔ اور اسی لئے یہ بوڑھا لنگوٹی والا صرف ایک سال کے لئے جینا چاہتا ہے۔
" ہوں۔ ! بھگوان نے خزاں کے مارے جھکے ہوئے پیڑ کی طرح ایستادہ لنگوٹی والے پر نظر ڈالی، اُن کا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ فرشتے سے بولے۔ دیش میں اتنی ہاہا کار مچی ہے تو یہ دانشور ادیب لیکھک کیا سو رہے۔ کیا اسی دن کے لئے ہم نے ان کے ہاتھ میں قلم پکڑایا تھا۔ بولو فرشتے بولو، تم بھی تو دوان اور گیانی ہو۔ قلم کی شکتی کو تو تم بھی جانتے ہو نا ...!
" انتریامی۔" فرشتہ سر جھکا کر بولا۔" بھارت والے ایک مثل بولتے تھے۔ بُرا مت دیکھو۔ بُرا مت سنو۔ بُرا مت کہو۔" اب راج کرنے والوں نے اس میں بھی

"برا" کا شیڈ نکال دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اتنی اچھی مثل میں لفظ بُرا آنا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ اب وہاں ڈنڈے کے زور پر یہ کہلوایا جاتا ہے۔"

"مت دیکھو، مت کہو، مت سنو۔"

اب آگے کوئی لیکھک، کوئی دانشور کچھ لکھتا بھی ہے تو اسے اندر کر دیا جاتا ہے۔ وہی ایمرجنسی! جس کا ذکر میں آپ سے ابھی کر چکا ہوں۔

اتنے سارے عرصے میں پہلی بار بھگوان کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ یہ شاید کسی خوبصورت سوچ کا نتیجہ تھی۔ وہ فرشتے سے رازداری سے بولے۔

"ابلیس کہاں ہے؟"

فرشتہ حیرت سے بولا۔ "ابلیس؟ یعنی شیطان ــــ؟"

"ہاں ہاں بھگوان خوشی سے بولے ــــ ایسا کرتے ہیں کہ شیطان کو انڈیا بھیج دیتے ہیں وہ وہاں.....

ابھی بھگوان نے اپنی اسکیم بتائی بھی نہیں تھی کہ فرشتہ جلدی سے بولا۔

"شیطان آل ریڈی انڈیا ہی میں ہے اور بیحد خوش ہے کیونکہ خوش نصیبی سے اس کی نس بندی نہیں ہو سکی۔ اس کے بیحد بال بچے ہیں۔ بڑا سکھی پریوار ہے۔

"وہ فیملی پلاننگ میں بلیو نہیں کرتا۔"

"سکھی پریوار"۔؟ بھگوان حیرت سے بولے۔ "جی ہاں" فرشتہ بے نیازی سے بولا ــــ "اکثر لیڈر پھر اور کس کی اولاد ہیں"؟

بھگوان پریشانی سے بولے۔ ایک ترکیب ذہن میں آئی تھی اس کا یہ حشر ہوا۔ اب کریں کیا کچھ عقل کام نہیں کر رہی ــــ"

ایک بات ہے سرکار۔ فرشتہ ذرا ڈرتے ڈرتے بولا "آپ کو مشورہ دینا تو

احمقانہ سی بات ہے لیکن میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے کہ اگر آپ چند دنوں کے لئے ان راج کرنے والوں کو یہاں بلوا .....

ایک دم دھڑکر کے زور دار آواز آئی یہاں وہاں سے پروں کو سرسراتے ہوئے بے حساب فرشتے اندر آئے اور سب بھگوان کے استھان کو لپکے۔ جنتی طبیب دید سب دوڑے آئے سارے میں لخلخے اور عطرِ فردوس کی مہکار ہو گئی ۔ بھگوان کو ہوش آگیا۔

"انتریامی۔ آخر آپ کس ڈر سے بے ہوش ہو گئے تھے، ایسا تو آج تک کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایک بزرگ فرشتے نے نرمی سے دریافت کیا۔

بھگوان ڈری ڈری آواز سے بولے۔ ہم۔ ہم۔ ہاں۔ ودوان فرشتے نے جب یہ اسکیم ہمارے سامنے رکھی کہ بھارت پر جو راج رچ رہے ہیں انھیں چند دنوں کے لئے بھارت کی بہتری کی خاطر یہاں بلا لیا جائے تو ہم بے ہوش ہو کر گر پڑے کہ وہ تو یہاں آکر بھی ایمرجنسی ڈکلیر کر دیں گے"؟

لنگوٹی والا جو پہلے ہی غموں سے جھکا کھڑا تھا اس حادثے سے اور بھی چور ہو گیا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔

ودوان فرشتہ ہی آگے آیا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "انتریامی ہم اور آپ سب اس معاملے کو سوچ چکے، کوئی حل نظر نہیں آتا۔ آپ بے چارے بھی ایسی حکومت کے آگے کیا کریں۔ بس جو ہو رہا ہے اسے دیکھ کر رو ہی سکتے ہیں۔ بہر حال میری ناچیز رائے یہ ہے کہ یہ کچھ سدھار کر سکے نہ کر سکے۔ اس کی حد درجہ نیک فطرت اور پاک نیت کے صلے میں اسے ایک سال کے لئے بھارت کا ٹور لگانے کی اجازت دے ہی دی جائے"

بھگوان دل شکستہ لہجے میں بولے ۔" ہمیں یہ بندہ بہت پسند ہے۔ ہم نہیں چاہیں گے کہ ہماری جنت ایسے بھلے اور نیک آدمی کو کھودے اسی لئے ہم سوچ رہے ہیں کہ اگر یہ واپس نہ آیا۔ یا نہ آنا چاہے تو —" ؟

دو دوان فرشتے نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکا دیا اور ادب سے کہا —" آپ اسے اپنا آشیرواد دیدیجئے انتریامی۔

آج ۳ ر دسمبر ۱۹۷۶ء دن سنیچر ہے۔ آپ دیکھ لیں گے یہ لنگوٹی والا دعدے کا کتنا سچا ہے! یہ ایک سال سے زیادہ کی مدت نہیں لے گا۔ اس بات پر یقین رکھئے۔"

ایک خواب کی سی کیفیت کے ساتھ فرشتہ اور لنگوٹی والا زمین پر اتار دیئے گئے۔

فرشتہ نرمی سے لنگوٹی والے کو مخاطب کرکے بولا۔" بھائی تم اتنے خاموش اور کھوئے کھوئے رہو گے تو کیسے گذارہ ہوگا؟ وہ تو بھگوان کی کرپا ہے کہ اس نے مجھے اتنا گیان دیا ہے کہ میں آنکھوں کے راستے دل میں اتر جاتا ہوں اور دل کی بات سمجھ لیتا ہوں۔ لیکن پھر بھی ایک بات کہوں گا کہ بات کرنے سے دل ہلکا ہو جاتا ہے۔"

لنگوٹی والا اسے ممنون نگاہوں سے دیکھے گیا۔ فرشتہ پھر بولا۔

" تمھیں پتہ ہے بھگوان تم سے بیحد خوش ہیں۔ اسی لئے انھوں نے تمھیں تین سو بدھائیں تین آسانیاں دی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر کسی جگہ کسی وجہ سے تم کسی سے خود کو چھپانا چاہو، اسے نظر نہ آنا چاہو تو تم غائب بھی ہو سکتے ہو۔ اور میں تو خیر ہوں ہی .... فرشتہ۔ لیکن تم اور میں ایک دوسرے کو دیکھ بھی سکیں گے۔ اور محسوس بھی کر سکیں گے۔

دوسری یہ کہ پلک جھپکتے میں تم جہاں چاہو اڑ کر جا سکو گے کیونکہ ایک سال کی مدت بہت کم ہے۔ اور تمہارا آدھے سے زیادہ وقت تو ریل، بس، ٹیکسی کے سفر ہی میں

کٹ جائے گا۔ اسی لئے یہ نعمت تمہیں عطا کی گئی۔

اور تیسری یہ کہ ـــ اور یہ بہت اہم بات تھی کہ تمہارے دل سے رحم، نرمی، پیار، محبت محسوس کرنے کا جذبہ نکال لیا گیا۔ کیونکہ تم ویسے ہی بہت محبت والے بندے ہو اور تمہارے دیش کی وہ حالت ہے کہ قدم قدم پر تم لوگوں کے لئے روؤ گے اس لئے تمہاری آنکھوں سے آنسو۔ تمہارے دل سے محبت اور تمہارے جذبات سے نرمی نکال لی گئی ہے۔ اور یہ میرے حسابوں بھگوان کا تم پر سب سے بڑا احسان ہے۔ اب تم ہر کیفیت سے گزر و گے۔ ہر جذبے کو سہو گے۔ لیکن انسان ہونے کے باوجود انسان کے دکھ پر رو نہ سکو گے کہ تم آگے ہی بہت دکھی ہو اور بھگوان تمہیں اور دکھی نہیں دیکھ سکتا۔"

لنگوٹی والے نے فرشتے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور فرشتے نے گھبرا کر منہ پھیر لیا۔ اُن آنکھوں میں کتنے زخم پوشیدہ تھے!!

اب وہ دونوں ایک ایسے مقام پر کھڑے تھے جہاں دُور دُور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے، کھیتوں میں ہل چل رہے تھے۔ ہلوں میں بیل بھی جُتے ہوئے تھے۔ اور انسان بھی۔

فرشتے نے لنگوٹی والے کی طرف دیکھا۔ تم مجھ سے بولتے نہیں ہو تو کیا ہوا۔ میں دل کی بات سمجھ لیتا ہوں۔ تم کسانوں اور کھیتوں کی حالت دیکھنا چاہتے تھے نا۔ تو دیکھو ـــ اس کسان کے بیل مر گئے تھے۔ اس نے کھیتوں کو پانی کے ساتھ اپنا خون بھی دیا ہے۔ اس نے اپنے دونوں بیٹے بھی ہل میں جوت دیئے ہیں تاکہ زمیندار اپنے قرضے کی وصولی کے لئے اسے تنگ نہ کرے اور قرض واپس نہ ملنے کی صورت میں اس کی جوان بیٹیوں سے وصولی نہ کرے۔"

لنگوٹی والے کے منہ سے ایک ٹھنڈی آہ نکل گئی۔ اب وہ دونوں ایک گاؤں کے کچے راستے پر چل رہے تھے۔

"میں جانتا ہوں کہ تم پیدل چل کر قریب سے ہر بات کا جائزہ لینا چاہتے ہو۔ اسی لئے میں تمھیں اڑا کر نہیں لے جارہا ہوں حالانکہ ہم چاہتے تو اڑ بھی سکتے تھے۔"

یہ ایک ہریجن بستی تھی۔ ایک بچہ اپنی ماں سے ضد کررہا تھا۔

"میں بھی اسکول جاؤں گا ماں۔ میں بھی پڑھوں گا۔ جمن دار کے بیٹے کی طرح میں بھی بستہ لٹکاؤں گا۔" ماں نے اُسے سینے سے لگا یا۔ اس کی آنکھیں ابل رہی تھیں۔ کونے سے بچے کا باپ گرجا۔

"حرام جادے بڑے لوگوں کی اسکول میں داکھل ہونے کی بات تیرے دماگ میں آئی کیسے رے۔" اور اس نے بچے کو زور سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور تڑاتڑ کئی دو ہتڑ رسید کر دیئے۔" اور پھر جمن دار کے گھر کی جھاڑو بہارو کون کرے گا۔ اُن کا موت کون اٹھائے گا تیرا باپ؟"

لنگوٹی والے نے منہ پھیر لیا۔ فرشتے کے ہاتھ پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی۔

"میں سمجھ گیا۔" فرشتہ نرمی سے بولا۔ تم اب دیر تک یہ منظر نہیں دیکھ سکتے۔ آگے چلو۔

آگے جمن دار کی حویلی کے مردانے میں وہ دونوں کھڑے تھے جو کسی کو نظر نہیں آرہے تھے مگر وہ دونوں سب کو اور سب کچھ دیکھ سکتے تھے۔ میلی کچیلی ایک جوان لڑکی کے کپڑے دھیرے دھیرے اتارے جارہے تھے اور ایک ایک عضو کی تعریف کی جارہی تھی۔ سفید پوش زمیندار ہولناک نظروں سے لڑکی کے جوان جسم کے بے پناہ خطوط کا جائزہ لے رہا تھا۔ اب آگے چند منٹوں میں جو ہونے والا تھا

اس سے بچانے کی خاطر فرشتہ اپنے نیک ساتھی کو لئے وہاں سے اُڑ گیا۔
اب وہ دونوں ایک عظیم الشان شہر کے بیچوں بیچ کھڑے تھے۔ ایک راشن کی دوکان کے آگے لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ خالی پیٹوں کی طرح خالی تھیلے لٹکائے نحیف وزار تھکے ہارے لوگ اپنی اپنی باری کے منتظر ۔۔۔ اچانک دو خاکی وردی والے ڈنڈے کھڑکھڑاتے ہوئے کہیں سے نمودار ہوئے اور لوگوں کو ڈنڈے برسا برسا کر منتشر کرنے لگے۔
سامنے سے ایک لمبی چوڑی کار سے ایک جوان سا آدمی چشمہ لگائے سفید کرتا پاجامہ پہنے، اپنے حالی موالیوں کے ساتھ اترا اور ایک ڈائس پر چڑھ کر تقریر کرنے لگا۔
" حالات اتنے گرے نہیں ہیں جتنے کہ بتائے جاتے ہیں۔ پھر ہم تو آپ کے سیوک ہیں۔ ہم تو آپ ہی کی سیوا کی خاطر اتنی دھوپ میں نکلتے ہیں تاکہ حالات کا جائزہ لیں اور آپ کے بھلے کی سوچیں۔ حکومت عنقریب آپ کی بستیوں میں نل لگوانے والی ہے کہ پانی سے بہت جلدی پیٹ بھر جاتا ہے اور پھر پانی کے بے پناہ فوائد ہیں۔ صفائی جو زندگی کی سب سے ضروری چیز ہے وہ پانی سے ہی ممکن ہے۔ بس یہ دھیان رہے کہ گندگی نہ پھیلے۔ کیونکہ جتنا آپ لوگ گندہ رہیں گے اتنی ہی بیماریاں پھیلیں گی۔ کیونکہ ہم آپ کے سیوک ہیں! اس لئے جتا رہے ہیں کہ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے عوام گندگی اور بیماری کے ہاتھوں مریں۔ اور اس بات کا خاص دھیان رکھیں کہ اپنے اپنے گھروں کے آگے درخت اُگائیں ۔۔۔ اس سے آپ کا شہر سندر رہے گا۔"
لمبی سی ایئر کنڈیشنڈ کار میں بیٹھ کر وہ سب چلے گئے۔ اور لنگوٹی والا منہ کھولے

دیکھتا ہی رہ گیا۔

"اب گودام کے اندر چلو ذرا" فرشتہ لنگوٹی والے کا ہاتھ تھام کر بولا۔ دونوں کسی کو نظر نہیں آ رہے تھے۔ جاتے جاتے لنگوٹی والے نے دکان پر ٹنگے بورڈ پڑھے۔

"شکر ختم ـــ چاول ختم۔ گیہوں ایک دو دن میں ملے گا۔"

اندر پہونچے تو چھتوں تک تھیلے اور بورے ٹھنگے پڑے تھے۔ پھولے پھولے فرشتے نے اپنے پہلو سے ایک چھرا نکالا۔ ایک بورے کا پیٹ چیرا۔ جھر جھر شکر گرنے لگی۔ دوسرے سے چاول۔ تیسرے سے گیہوں۔

یہ سب اسی طرح بھرے ہوئے ہیں۔ اب چلو! دوسری جگہ چلتے ہیں۔"

ایک بڑی سی حویلی تھی۔ اچھا خاصا محل، سفید سفید کرتے پاجامے پہنے، موٹی موٹی توندوں والے چند سیٹھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"تیل کا دام بڑھا دینا چاہیئے۔"

"گیہوں کو ابھی کچھ دنوں کے لئے اور روک رکھو۔" چاول کے تھیلوں میں ۵۰-۵ کلو کنکر ملا دو۔" اور ہر تھیلے سے ۵۰-۵ کلو چاول نکال لو۔"

"بسکٹ پرسوں تک پہونچ جائیں گے۔ نیچے جو تہہ خانہ ہے۔ جہاں گیہوں کے بورے پڑے سڑ رہے ہیں۔ وہ راشن کی دوکانوں میں چند دنوں کے بعد بھجوا دو۔ اور وہ جگہ بسکٹ کی پیٹیوں کے لئے خالی کر دو۔"

اب چلو تمہیں بچوں کی اسکولوں میں لے چلیں۔ تم دیکھنا چاہتے ہو نا۔؟ لنگوٹی والے نے مجبور نگاہوں سے فرشتے کو دیکھا۔ بولا کچھ نہیں۔ اب وہ لوگ ایک اسکول کے احاطے میں تھے۔ کانوں میں دور سے معصوم آوازیں پڑیں۔

سارے جہاں سے اچھا...

اندر بھوک سے نڈھال بچے تھے۔ اور حالات سے جھلائے ہوئے استاد۔ پھٹی ہوئی نیکریں پہنے ہوئے بچے۔ برائے نام کرتے اور قمیض! منتظم لوگ آئے۔ اور کچی پانی دودھ تقسیم ہونے لگا۔ بچے خوشی کے مارے بے حال ہونے لگے۔ گندی سندی میل سے اٹی ہتھیلیاں بڑھیں۔ ان میں مونگ پھلیاں اور سخت پاؤ کے سلائس ڈال دیئے گئے۔

سارے جہاں سے اچھا.....

ننگوٹی والے کے ہاتھ میں بھی کسی نے چند پھلیاں تھما دیں۔ کوئی بڑبڑایا۔

"اسکولوں میں بھکاریوں کو کیوں آنے دیتے ہیں۔ کم بخت پتہ نہیں"

فرشتہ اپنے حلیے سے آدمی نظر آتا تھا۔ معقول آدمی۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ شاید کسی نے اسے ماسٹر سمجھا۔ دونوں باہر نکل آئے۔

اب وہ لوگ ایک اور ہی شہر میں تھے۔ ایک جگہ دونوں ٹھٹھک گئے۔ جگہ جگہ پولیس کا بندوبست تھا۔ کسی بڑے آدمی کی سواری آنے والی تھی غالباً۔ بیحد خاموش قسم کا ہجوم جمع ہو رہا تھا۔ کسی نے دوسرے سے سرگوشی کی — یہ سالے لیڈر لوگ اپنی تقریر سنوانے کے لئے مفت کے ٹرک چلواتے ہیں تاکہ خوب ساری پبلک جمع ہو۔ اور دنیا والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکی جا سکے۔"

"ابے چپ سالے۔ پولیس نے سن لیا تو اندر ہو جائے گا۔ حالت ہو جائے گی!"

پھر ٹرک بھر بھر کر لوگ آنے لگے۔ کسی نسوانی آواز نے ڈائس سے کہنا شروع کیا۔

"لوگ ہمیں سمجھتے نہیں ہیں۔ ہمارے آگے بہت سی کٹھنائیاں ہیں۔ ہم انھیں جادو کے زور سے تو اچھا کر نہیں سکتے۔ ہم خود چاہتے ہیں کہ ہمارے عوام سکھ سے رہیں۔ اور

اس کے لئے ہم کوشش کر بھی رہے ہیں۔ ہم آئے دن نئے نئے کارخانے، فیکٹریاں کھول رہے ہیں۔ غریبوں کے لئے مکانات بنا رہے ہیں۔ غریب کسانوں میں زمین بانٹ رہے ہیں۔ کس لئے کہ آپ سکھ سے رہیں لیکن چند لوگ ایسے بھی ہیں جو آپ کو بہکاتے ہیں ــــ ان دشمنوں سے آپ لوگوں کو ساودھان رہنا چاہیئے اور غریبی مٹانے کے پروگرام میں ہماری مدد کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ہم صرف آپ ہی کی وجہ سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اب میرے ساتھ تین بار زور سے جے ہند کہئے ــــ

دھنیہ واد ـ

والنٹیرز کا ایک ریلا آیا اور وہ دونوں دھکے سے کئی گز پیچھے جا پڑے۔ فرشتے نے ایک دم اپنے پہلو سے کپڑوں میں چھپا پستول نکال لیا۔ لنگوٹی والے نے حیرت سے فرشتے کو دیکھا۔ فرشتہ مسکرا کر بولا ـ

"میں جنت سے چلتے وقت یہ پستول لے کر چلا تھا۔ برے بھلے وقت کے لئے ۔ میں بہت غصہ والا فرشتہ ہوں۔ تم نے سنا ہوگا میں بھگوان سے بھی بدتمیزی کر لیتا ہوں ۔ اور بھگوان بڑے مہربان ہیں معاف کر بھی دیتے ہیں ۔ اگر کسی نے تمھیں کچھ کہا تو میں سالے کو بھون کر رکھ دوں گا۔ تم نہ صرف میری امانت ہو بلکہ بھگوان کی بھی امانت ہو۔ اور جنت کا تحفہ ہو" اس نے بڑی محبت اور عقیدت بھری نظروں سے لنگوٹی والے کو دیکھا۔ اور پستول واپس اپنے کپڑوں میں چھپا لیا۔

چلتے چلتے انھیں کئی دن ہو گئے تھے ۔ ان سارے دنوں میں حالات ان کے دیکھتے ہی دیکھتے بدل رہے تھے۔ لنگوٹی والا جو پہلے ہی دبلا پتلا کمزور سا آدمی تھا۔ آدھا بھی نہیں رہ گیا تھا۔ مٹھی بھر ہڈیوں کو لئے وہ جہاں بیٹھتا وہیں ڈھیر ہو جاتا۔ فرشتہ اسے دلاسہ دیتا ــــ

ارے یار تم تو ابھی سے تھک گئے۔ تم تو سال بھر کے ٹور پر نکلے ہو۔ اور دیکھو اتنے دل گرفتہ اور اداس مت ہو۔ اچھا ہی ہوا بھگوان نے تمہارے آنسو اپنے پاس رکھ لئے تھے۔ ورنہ تو تم یہاں روتے روتے ہی مر جاتے۔ پھر بھی ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ دیکھو حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ الیکشن ہونیوالے ہیں تمہارے لوگوں نے اگر عقلمندی کا ثبوت دیا اور نئی حکومت چُن لی تو، جیسا کہ ہم اور تم روز بھاشن سُن رہے ہیں، کچھ نہ کچھ فرق پڑ جائے گا۔ بلکہ بہت کچھ فرق پڑ جائے گا۔ پھر جنت میں فل سوٹ بھی پہننا اور لنچ ڈنر بھی کھانا اور دھانسو قسم کا بریک فاسٹ..... اس نے مسکرا کر لنگوٹی والے کو بھی مسکرانا چاہا مگر اس کے لب سِلے ہوئے تھے۔

مارچ ۱۹۷۷ء کا ہنگامہ خیز مہینہ آیا اور گذر گیا۔ فرشتے اور لنگوٹی والے کی یاترا جاری رہی لوگوں میں ایک نیا جوش و خروش تھا، اتساہ تھا، چہروں پر خوشی تھی۔ آنے والے دنوں کی سنہری پرچھائیاں تھیں لیکن ـــــ فرشتہ ایک دن ذرا پریشانی سے بولا "یار پھر وہی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے"

لنگوٹی والے نے خاموشی سے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ مجھے بھگوان نے تمہارے دل کا حال جاننے کی شکتی دے رکھی ہے۔ تمہارا دل کچھ خوش نہیں معلوم ہوتا" پھر وہ سر جھکا کر کچھ نادم نادم سا ہو کر بولا۔

"اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اپنا بھی دل کچھ خوش نہیں معلوم ہوتا۔ پھر وہ لنگوٹی والے کے کان کے پاس منہ لا کر بولا۔ یار وہ زور دار تقریریں، بھاشن، وہ چہل پہل، وہ وعدے جو ابھی ۱۵ مارچ ۱۹۷۷ء سے پہلے پہلے تھے، وہ ٹھنڈے کیوں پڑ گئے؟" لنگوٹی والا دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا تھا ـــ

فرشتہ پھر کہنے گیا ـــ ابھی چند روز پہلے میں نے اپنے گیان سے پتہ چلا لیا تھا کہ دِل تمھارا ابھی کچھ مطمئن اور خوش ہو رہا ہے کہ برسوں سے جمی ہوئی کالک، تاریکی، اندھیرا شاید دور ہو ہی جائے اور واقعی یہ نیا راج اپنی کرامات دکھا ہی دے لیکن......

وہ رُک کر کچھ بھنا کر بولا ـــ " بھگوان نے تمہارے آنسو اپنے پاس رکھے تھے۔ زبان تو نہیں رکھی تھی نا۔ تم بولتے کیوں نہیں کچھ۔ میں کب تک اکیلا بک کئے جاؤں؟"

اس نے گھانس کا ایک تنکا توڑ کر منہ میں چبایا۔

" ابھی تو تمہارے دَور کے چھ مہینے بھی پورے نہیں ہوئے ہیں۔ سال کیسے گذارو گے۔؟ آں ؟ اچھا چلو اب نئے دَور کی نئی حکومت کا ڈھول ماریں۔ ایں!

"چلیں"ـــ ؟ پھر وہ کچھ ہچکچا کر بولا۔ " مگر یار حکومت تو بدل گئی ہے مگر لگتا ہے انہی جسموں پر نئے چہرے اُگ آئے ہیں۔ باقی سب کچھ وہی لگتا ہے"

وہی سڑکیں، وہی گلیاں، وہی کھیت کھلیان، وہی بڑے چھوٹے کا امتیاز، وہی غریبی، وہی دُکھ، کچھ بھی نہیں بدلا بھائی۔ فرشتہ قدم قدم پر لنگوٹی والے کو ڈر ڈر کر دیکھتا رہا۔

بھگوان نے شاید اس کے آنسو اپنے پاس رکھ کر اچھا نہیں کیا۔ رو دیتا تو من ہلکا ہو جاتا۔ فرشتے نے سوچا۔

" چلو کچھ کھا پی کر تازہ دم ہوتے ہیں پھر گھومنے نکلتے ہیں۔" فرشتہ خوش دلی سے بولا۔

ایک چالو قسم کی ہوٹل کے سامنے والے بنچ پر بیٹھ کر فرشتے نے آواز لگائی۔

" دو پلیٹ بھجیہ اور ۲ پاؤ"

چھوکرے نے ۲ گلاس میلا میلا پانی، ۲ پلیٹ ٹھنڈا باسی بھجیہ اور ۲ لکڑ توڑ پاؤ

لاکر رکھے تو فرشتہ کا دماغ گرم ہو گیا۔

"یہ ہمارے لئے ہے ۔۔۔؟"

"تو کیا آپ آسمان سے تشریف لائے ہیں کہ آپ کے لئے اسپیشل بھجیہ پاؤ بنے گا؟"

فرشتے نے گڑبڑا کر لنگوٹی والے کو دیکھا جو قیمت کے بورڈ پر نگاہیں لگائے بیٹھا تھا۔ اب فرشتے نے بھی سٹ پٹا کر دیکھا اور ہوٹل والے سے پوچھا۔

"بھائی صاحب یہ بھجیہ اور پاؤ کیا دام کے ہیں؟"

"سوا، سوا روپیہ" ۔۔۔ وہ ریزگاری گنتے ہوئے بے نیازی سے بولا۔

"ارے بھائی ابھی تین چار مہینے پہلے ہم نے اسی ہوٹل سے آٹھ آنے میں کھائے تھے۔"

"ہاں، ہاں" وہ اسی بے نیازی سے بولا۔ "اب اپن کا، پبلک راج ہے۔ تیل کا بھاؤ تیرہ روپے کلو چل رہا ہے۔ دال مسری ۴ روپے کلو ہو گئی ہے پہلے دال ۲ روپے کلو تھی اور تیل ۸ روپے۔ اور اب زیادہ ہوشیاری مت دکھاؤ جلدی سے سیٹ خالی کرو۔ بزنس کا ٹیم ہے۔"

فرشتے نے لنگوٹی والے کو ۔۔۔ اور لنگوٹی والے نے فرشتے کو دیکھا اور چپ چاپ بل ادا کر کے چلتے بنے۔

اس بڑے شہر کے ایک بازار سے گذرتے ہوئے ایک نہایت ہی دل سکن اور ساتھ ہی حیا سوز نظارے سے دونوں کو دوچار ہونا پڑا۔

ایک بھکارن عورت سامنے آگئی اور اپنے بلاؤز کے بٹن کھول کر اپنی جوانی کے انمول پھلوں کو بے پردہ کرتی ہوئی فرشتے سے بولی۔

"بابو خالی آٹھ آنے لیوں گی۔ جاستی نہیں۔" فرشتہ منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ لنگوٹی والا بوڑھا تھا، عورت اس سے مخاطب ہوئی بھی نہیں تھی۔

وہ گھوم کر پھر فرشتے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ "بابو دیکھ بچہ بھوکا ہے۔ دعا ملیں گی تیرے کو۔ کیا کرنا رے بابو۔ دیکھ مہنگائی کتنی بڑھ گئی۔ پہلے کون سے سُکھی تھے۔ پن اب تو بالکل ہی چوپٹ نگری ہوگئی ۔۔۔۔ ابھی دیکھ بابو میرے ساتھ کی کھولی والے مرد نے پہلے اپنی جورو کو زہر پلایا۔ پھر دونوں تینوں بچوں کو۔ پھر کھود بھی زہر پی کے سوگیا۔ مگر وہ مرد تھا۔ اس میں اُتّی ہمت تھی۔ میں عورت جات بچے کا موہ نہیں مرنے دیتا۔"

جتنے چلر پیسے تھے اس کی ہتھیلی میں جھٹک کر فرشتہ لنگوٹی والے سمیت نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

دوسرے شہر میں جاکر وہ اپنے آپے میں آگیا۔ مارے افسوس اور تاسف کے اس کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ وہ بڑے عجیب انداز سے بولا۔

"یار۔ بھگوان اگر میرے بھی آنسو اپنے پاس رکھ لیتا تو اس کا کیا بگڑ جاتا"

لنگوٹی والے کو خاموش دیکھ کر وہ اسے خوش کرنے کے انداز سے بولا۔

"چلو کسی اچھی سی جگہ چلیں۔"

راستے میں ایک مجسمے کے گلے میں چپلوں اور جوتوں کا ہار دیکھ کر فرشتہ رک گیا۔ کچھ حیرت سے لنگوٹی والے کو دیکھ کر بولا۔

"یہ تو مجھے تمہاری مورتی جیسی لگتی ہے۔ لیکن یہ کون نالائق ہیں جنھوں نے تم جیسے نیک اور بھلے مانس کو چپل جوتے پہنا دیئے ہیں؟ اس ویش کا واقعی جواب نہیں مگر یار یہ حرکت عوام نہیں کرسکتے۔ یہ ضرور کسی کرسی والے کی حرکت ہے۔"

لنگوٹی والے کے دل پر نہ حیرت کا جذبہ ابھرا۔ نہ افسوس کا۔ فرشتہ چلنے لگا تو وہ بھی چل پڑا۔ اب وہ ایک ایسے گاؤں میں کھڑے ہوئے تھے جہاں بیک وقت گیارہ زند؟

انسان دھڑا دھڑ آگ میں جلائے جا رہے تھے۔

"بیک وقت گیارہ آدمی کس بیماری سے مرگئے بھائی؟" فرشتے نے ایک گاؤں والے سے پوچھا۔

"بیماری نہیں ــــ غریبی اور جو اسے بیماری سمجھتے ہو تو سمجھو یہ چھوت کی بیماری ہے۔ ہم ہریجن ہیں نا" اور وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ آگ کے جلتے شعلوں کے سامنے بیک وقت اتنی لاشوں کی موجودگی میں ہنستا ہوا وہ انسان بیحد بھیانک لگا۔

فرشتہ تیزی سے پلٹا۔ لنگوٹی والے کا ہاتھ تھاما اور دوسرے شہر کو اڑ گیا۔

راستے میں ایک جگہ کچرے کے ڈھیر سے کئی بچے گندی چیزیں چن کر کھا رہے تھے اور لڑ جھگڑ کر ایک دوسرے سے چھین رہے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے نظر چرالی!

فرشتے اور لنگوٹی والے کو پیسوں کی کوئی خاص ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ فرشتہ اپنے ساتھ بس اتنی رقم لیکر نکلا تھا کہ سال بھر دونوں کا گذارہ ہو جائے۔ لیکن اتنی کم رقم میں وہ اخبار خریدنے کی عیاشی ضرور کر لیتا تھا۔ اس دن صبح ہی صبح اخبار خرید کر وہ پڑھنے بیٹھا تو جل کر لنگوٹی والے سے

"یہ کمیشن وہ کمیشن۔ ارے اتنے تحقیقاتی کمیشن بٹھا رہے ہو تو سب سے پہلے ایک کمیشن اپنے اعمال نامے پر بھی بٹھاؤ۔"

لنگوٹی والا کچھ نہ بولا۔ دراصل اس کا کچھ نہ بولنا ہی فرشتے کو سخت تکلیف دے رہا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ جتنا یہ خاموش رہے گا اتنا ہی گھٹ گھٹ کر جئے گا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا بھگوان نے اس کے آنسو اور دل کی درد مندی اپنے پاس رکھ کر کچھ اچھا نہیں کیا۔ وہ طرح طرح سے لنگوٹی والے کو ہنسانے بہلانے کی کوشش

کرتا۔ لیکن شاید اس کی ہنسی بھی بھگوان نے گروی رکھ لی تھی۔

اُس دن سڑک پر کپڑا مل میں کام کرنے والے مزدوروں کا ایک جلوس نکلا جو مہنگائی کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے زیادہ اجرت کی مانگ کر رہا تھا ــــ اور حسب معمول مالکان مجبوریوں کا رونا رو رہے تھے۔ فرشتے نے لنگوٹی والے کا ہاتھ پکڑا، لوگوں کی نظروں سے غائب ہو کر دونوں مل مالک کی کوٹھی میں جا کر کھڑے ہوئے۔ فرشتہ طنز سے بولا۔

"واہ واہ ــــ جنت یاد آگئی۔ یار لوگوں نے دنیا میں ہی جنت بنالی ہے۔ تو وہاں آکر کیا خوش ہوں گے؟ دیکھو کیا حوض ہیں۔ ان میں تیرتی ہوئی مچھلیاں بھی اور لڑکیاں بھی۔ دیواروں پر چاندی سونے کی پچی کاری۔ فرش پر قالین، خدام لڑکے لڑکیاں شراب سے بھرے پیالے لئے مہمانوں کو سرد کرتے ہوئے ــــ لعنت ہے تھو! فرشتہ غصّے سے بولا ــــ "یہاں دولت کا اس قدر ناجائز اور بے جا اسراف اور باہر مزدور دو وقت کی روٹی کو محتاج ــــ تم ٹھیک ہو لنگوٹی والے۔ بھگوان سے تمہارا یہ اسٹینڈ بالکل ٹھیک ہے کہ جب تک میرے لوگوں کو بھر پیٹ کھانا اور تن بھر کپڑا نہیں ملے گا، نہ میں پیٹ بھر کھاؤں گا نہ تن بھر پہنوں گا۔" لنگوٹی والے کو گم سم دیکھ کر اس نے اس کا ہاتھ تھاما اور اس کوٹھی سے باہر نکل آیا۔

"چلو اس مل مالک کے ہاتھ کے نیچے کام کرنے والے کسی مزدور کا گھر بھی دیکھیں اب۔" فرشتے نے لنگوٹی والے کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"ترے مجبور بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا۔"

فرشتے نے چونک کر لنگوٹی والے کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ تو خاموش تھے

پھر ایک مجبور پکار کیسی سنائی دی؟ فرشتہ گڑبڑا کر بولا۔ "تم ابھی کچھ کہہ رہے تھے؟
لنگوٹی والے نے بے بسی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ فرشتہ اسے اس درجہ خاموش
دیکھ کر سخت شرمندہ ہوا۔ "شاید تمہارے دل سے یہ آہ آواز بن کر نکل رہی ہے۔"

ترے مجبور بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا!

"چلو، چلو اپنے مقدر کی جتنی کٹھن گھڑیاں ہیں سمیٹ لو کہ بھگوان سے یہ جہنم
تمہیں نے مانگا تھا۔" فرشتہ دل ہی دل میں بولا۔

وہ ۱۹ر جولائی ۱۹۵۸ء پیر کا ایک اداس ساون تھا۔ مجبوریوں اور نامرادیوں کا
ایک شاہکار مرقع۔ ایک ٹوٹا پھوٹا گھر، جو گھر کی قسمت تھا، جہاں ٹاٹ کے پھٹے
پرانے چیتھڑے نما ایک پردہ جھول رہا تھا۔ میلے کچیلے دو چار برتن اوندھے پڑے
تھے۔ ایک الگنی پر ہزاروں سوراخوں والی ایک میلی ساڑی جھول رہی تھی۔ وہ ہاتھ
جو سارے بھارت کو ریشم اور نائلون بُن بُن کر پہنا رہے تھے، اپنی ہی لاش کو کفنانے
سے معذور تھے۔ مزدور گھر والا شاید کام پر جا چکا تھا، کیوں کہ گھر میں صرف ادھ کی
تباہ حال معصوم صورت بیوی یا ڈھائی تین سال کا ایک دبلا پتلا کمزور سا بھولا بھالا
بچّہ جو بھوک کے مارے تلملا رہا تھا۔ ایڑیاں پٹخ پٹخ کر رو رہا تھا، کھانا مانگ رہا تھا۔
"ہم اندر آسکتے ہیں بھائی؟" فرشتے نے پکارا۔ "وہ تو کام پر گئے ہیں۔" عورت پردہ
ہٹا کر بولی۔، پھر ایک تباہ حال بوڑھے اور ایک تھکے ماندے آدمی کو دیکھا تو راستہ
دیتی ہوئی بولی۔

"مگر آپ لوگ آجائیں۔ پانی پی کر، روٹی کھا کر ہی جائیں۔"

"جھوٹی ——" بچہ غصّے سے بولا۔ "میرے کو تو روٹی نہیں دی، ان کو کہاں سے دے گی۔"

ماں کے چہرے پر ایک درد مند مسکراہٹ آئی۔ وہ دونوں کو جھلنگے پلنگ پر بٹھاتی ہوئی دھیرے سے بولی ــــ "آپ لوگ برا نہ مانیں بچّہ ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" فرشتہ جلدی سے بولا۔ "اور پھر اُس نے کہا ہی کیا ہے کہ ہم بُرا مانیں۔"

"آپ لوگ بیٹھئے میں پانی تو لے آؤں۔"

لنگوٹی والا جن نظروں سے دیکھ رہا تھا، اسے دیکھ کر فرشتہ چونک سا گیا۔ لنگوٹی والے کی آنکھوں میں بیک وقت ہمدردی، محبّت، درد مندی کے جذبات لپک رہے تھے۔ وہ کچھ نہ بولا۔ عورت پانی لے کر آئی تو بچّہ پھر رونے لگا۔

"میرے کو دال روٹی دے۔"

"کہاں سے دوں ــــ؟" وہ دونوں کو سُناتی ہوئی بولی۔ "دال ہی ہماری زندگی تھی، وہ بھی چار روپے کلو ہوگئی۔ سبزی بھاجی کا تو پوچھو ہی مت۔ کیا کھائیں اور کیسے زندہ رہیں۔ دو ایک مٹھی دال تھی، ہانڈی بھر پانی میں چڑھا چھوڑی ہے، وہ کارخانے سے آئیں گے، بوڑھی ساس ہے، میں ہوں، یہ بچّہ ہے اور وہ وقت کا کھانا اسی میں نپٹانا ہے۔"

کوئی کچھ نہ بولا۔ وہ بناوٹی ہنسی ہنسی۔ کوئی اس کے ساتھ نہ ہنسا۔ وہ پھر سے خود سے سنانے لگی۔ "پتلی دال سے یہ بھید چڑتا ہے۔ اب چڑے بھی تو کرے کیا۔ روتے روتے سو جاتا ہے۔ سوتے سوتے رونے لگتا ہے۔ کبھی کبھی دو دو دن یونہی نکل جاتے ہیں۔ میں بھی ساتھ ہی رونے لگتی ہوں۔ جب یہ پیٹ بجا بجا کر کہتا ہے "ماں یہاں آگ لگی ہے۔ کچھ کھانے کو دے دے۔ تو۔ تو میرا جی چاہتا ہے کہ ساری دنیا میں آگ لگا دوں۔ مگر..... مگر وہ اکدم خود پر قابو پا گئی اور مہمانوں کی موجودگی کا احساس

کر کے مسکرانے لگی۔ لیکن اسی لمحہ لنگوٹی والا پہلی بار زور سے رو کر چلّایا۔

نہیں — نہیں — نہیں۔

فرشتے نے بری طرح چونک کر دیکھا۔ لنگوٹی والے کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہہ رہے تھے۔ دردمندی جذبات اور آنسوؤں کا وہ خزانہ جسے بھگوان نے اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا، لنگوٹی والے کی آنکھوں میں دل میں ہی محفوظ تھا۔ یہ وہ دولت ہے جسے بھگوان بھی نہیں چھین سکا تھا۔

بوڑھے لنگوٹی والے کو روتا دیکھ کر بچہ دھیرے سے اٹھ کر اس کی گود میں بیٹھا اپنا رونا بھول کر اس سے پوچھنے لگا۔" اچھے بابو تم کیوں روتے ہو۔ کیا تم بھی میری طرح بھوکے ہو۔؟"

" ہاں میرے بچّے میں بھی بھوکا ہوں — اور میری بھوک تم مٹاؤ گے بیٹا، تمھیں روٹیوں کی بھوک لگتی ہے بیٹا، مجھے خوشیوں کی بھوک لگی ہے۔ آج سے نہیں برسوں سے — اور میری بھوک تم مٹاؤ گے میرے بچّے — تم —"

" تمھارا نام کیا ہے بابو —" وہ حیرت سے بولا۔ " میرا نام" — وہ رک کر بولا۔ " موہن داس کرم چند گاندھی۔"

فرشتہ حیرت کے مارے بوکھلایا ہوا کھڑا تھا۔ عورت مارے خوشی اور آنسوؤں کے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

" بابو میرے بڑے نصیب کہ آپ میری کٹیا میں آئے لیکن بڑی ابھاگن ہوں بابو کہ میں آپ کو ایک وقت کی روٹی بھی نہیں کھلا سکتی۔ بچّے کی خاطر میں جھوٹ کہہ رہی تھی، اب سچ سناتی ہوں کہ ہانڈی میں صرف پانی پک رہا ہے کہ بچّہ بہلا رہے ..... ایک درد بھری چیخ کے ساتھ اچانک ایک دم بابو نے بچے کو گود سے

اتارا اور جھپٹ کر فرشتے کے پہلو سے نکلا پستول نکالا اور ان تینوں کے دیکھتے دیکھتے ایک ساتھ چھ گولیاں اپنے سینے میں اتار لیں !!

فرشتہ نے بڑھ کر گرتے ہوئے باپو کو سنبھالا جن کی زبان پر بھگوان کا نام تھا فرشتے نے دونوں ہاتھوں پر باپو کو سنبھالا اور زیر لب کہا۔ "یاد رکھنا لوگو پہلی بار تو تم نے انھیں قتل کیا تھا اس بار خود انھوں نے اپنا سئے دیکھ کر خودکشی کر لی ہے۔ وہ اس مہربان چہرے پر جھکا جو مرتے مرتے بچے کو بڑی آس بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ مرتی ہوئی آنکھیں زبان حال سے کہہ رہی تھیں۔

"اے میری امیدوں کے چراغ میں اس دنیا میں پھر آؤں گا، اس آس کے ساتھ کہ پھر کسی آنکھ میں آنسو نہ دیکھوں ـــ اور میری یہ آشا صرف تمھیں پوری کر سکتے ہو۔ صرف تم، جو ایک خوبصورت اور آس بھرے کل کا جیتا جاگتا روپ ہو"

"باپو ـــ باپو ـــ" بچے نے باپو کو ہلایا۔ کھانا کھا کر جانا باپو ـــ دال بس پکنے ہی ہو گئی" اور جس جگہ اس نے اپنے چھوٹے سے ہاتھ کو رکھ کر باپو کو جگانے کی کوشش کی تھی وہ باپو کا امیدوں اور ارمان بھرا دل تھا جہاں سے خون رس رس کر دھرتی کو گلزار بنا رہا تھا۔

فرشتہ جب دونوں ہاتھوں پر باپو کی لاش سنبھالے دھیرے دھیرے نظروں سے اوجھل ہو گیا تو روتی ہوئی ماں نے بچے کے مقدس ہاتھ کو تھام کر سسکتے ہوئے کہا ـــ "میرے بچے، خونِ دل میں ڈوبی ہوئی انگلیوں سے وقت کے ماتھے پر آج ایک تحریر لکھ دے کہ "میرے باپو کا سنہرا خواب ضرور پورا ہو گا ـــ" وہ خواب جو آج تک تو ادھورا ہی ہے ـــ"

حوّا کا گناہ

گاؤں میں کال پڑا تو راگھو چمار اپنی جوان بٹیا رچمپا کو دادا جان کے ہاتھوں تیس روپے میں بیچ گیا ـــــ دادا جان تو تیس روپے دینے پر بھی راضی نہ ہوئے تھے۔ مگر پھوپھا صاحب، ماموں جان اور پھر لڑکے بالوں نے کچھ خدا کا خوف دلایا اور کچھ یونہی رحم کی بارش برسانے کی ترغیب دلائی تو انھوں نے حامی بھر لی۔

راگھو چمار یونہی سر سیمہ سا کھڑا رہا ـــــ تیس روپے کے ساتھ ساتھ بہت سارے طعنے تشنے بھی دادا جان نے اس کی جھولی میں انڈیل دیئے ـــــ تیس روپے کا غم ابھی تک انھیں ستا رہا تھا۔ تنک کر بولے ـــــ

"اپنے ساتھ شہر کیوں نہیں لے کر چلا جاتا ـــــ؟"

"جی ہجور ـــــ جوان چھوکری۔ اوپر سے بیوہ بھی ـــــ کچھ دل نہیں مانتا، کچھ جمانے سو کھوپ آتا ہے۔"

"ہونہہ زمانے کا خون ـــــ" دادا جان نے حقے کے نے زور سے گڑگڑائی ـــــ "جیسا ہم جانتے ہی نہیں! سارے گاؤں میں تو دیدے لڑاتی پھرتی ہے ـــــ" (ان کے غصے کی اصل وجہ یہی تھی)

'بجور' کے سامنے رانگھو کی زبان کیا کھلتی بے بسی سے سر جھکا کر رہ گیا ۔۔۔ چھپانے
ایسی نکھی اور کھا جانے والی نظروں سے دادا جان کو دیکھا کہ ایک بار تو وہ بھی ذرا
بوکھلا کر رہ گئے ۔۔۔ بات چلانے کو وہ اسی طرح بولے ۔

" ارے تم لوگوں کی عزت بھی کوئی عزت ہے ۔۔۔ میں تو تم ایسوں کو گھر میں گھسنے بھی
نہ دوں' وہ تو ننھے میاں کی پیالیاں اور پوتڑے دھونے کے لئے ایک جھوکرا
کی ضرورت بھی تھی، اس لئے رکھ لیا اس چمارن کو ۔" انہوں نے بھرپور نفرت کے
ساتھ پٹاخ سے اگالدان میں تھوک دیا ۔۔۔

گاؤں میں ایک تو اناج کا کال ۔۔۔ پھر پیسے کا کال ۔ اونہہ پیسے کا کال
تو سدا سے ہی تھا ۔۔۔ دادا جان کے ہاں مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی ۔۔۔ انگریزی
حکومت نے سگڑ دادا کو چار چھ گاؤں کسی بات پر خوش ہو کر عنایت کر دیئے
تھے ۔ یہ انگریز حاکم بھی خوب تھے جہاں خوش ہوئے اکدم زمینیں بخش ڈالیں ۔
اب یہ سارا گاؤں میرے دادا جان ہی کا تھا ۔۔۔ ان ہی کی حکومت تھی ۔۔۔
وہ بڑے اچھے حاکم تھے ۔ اور خدا کو بہت مانتے تھے' غریبوں کی بڑی مدد کرتے'
مذہب کی طرف سے کسی کو غافل دیکھتے تو اس کے کان ہی اکھڑوا لیتے ۔۔۔ مذہب نے انہیں
غریبوں کا بڑا ہمدرد بنا دیا تھا ۔ کیونکہ اپنے مذہب میں ہے کہ غریبوں کو بھی انسان سمجھو'
دادا میاں نے تو باقاعدہ عدل جہانگیری کو RENEW کر ڈالا تھا ۔۔۔ سچ مچ کی ایک
گھنٹی بڑے دروازے سے لٹکتی رہتی اور شکایتیں لانے والے انصاف پاتے ۔۔۔

اب بھی رانگھو چمار اپنی بٹیا کو لئے آیا تو دادا جان سے ناں کہتے بن نہ پڑی ۔۔۔
کھٹ دنی سے قلم دان سے تیس روپے نکال کر رانگھو کے آگے پھینک دیئے ۔۔۔
بھلا کون ایسی بدچلن کے تیس روپے بھی دیتا ؟ مگر دادا جان سے مشکل تھا کہ کسی

غریب کے پیٹ پر لات مارتے۔

راگھو چار تو تیس روپے اپنی دھوتی میں اڑس کر کسی دن شہر چلا گیا، بھلا وہ گاؤں میں کس کے لئے ٹھہرتا؟ بیوی تو زمانہ ہوا مر چکی تھی۔ ایک جوان چھوکری چمپا تھی جو دن بھر یہاں وہاں کدکتی پھرتی تھی ــــ پھر ایک دن باپ نے پکڑ کر جا کے سامنے کسی کے پلو سے پلو باندھ دیا ــــ قسمت کی ایسی پوری تھی کہ سال بھر بھی نہ ہونے پایا کہ مرد مر گیا ــــ مرد کے مرنے کے بعد بچہ ہوا، سال بھر کا ہو کر وہ بھی نمونیہ سے مر گیا ــــ دو ہی برس میں زندگی کے سارے راستے ختم ہو گئے اور اب وہ پھر باپ کے پاس تھی۔ ــــ لوگ کہتے تھے بڑی آوارہ ہے، راہ چلتے پوتوں کو تاکتی پھرتی ہے ــــ کوئی یہ جواز نکالتا کہ اپنے مرے ہوؤں کو ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ کئی بار دادا جان کی عدالت میں اس کے مقدمے آئے اور ہر بار دادا جان نے راگھو کو تنبیہہ کی کہ اس نے آگے سے دھیان نہ رکھا تو دونوں کو گاؤں سے باہر کر دیا جائے گا۔ یوں تو اب تک انھیں گاؤں باہر کر ہی دینا چاہیے تھا!۔ مگر یہاں بھی دادا جان کی نرم دلی آڑے آ جاتی۔

اور اب تو ہر ٹھیر کردہ ہمارے ہی در پر آ پڑی تھی ــــ!

ان دنوں میں ضرورت سے زیادہ سمجھدار تھی۔ اور ہر بات کی تہہ تک اتر جانا میری عادت تھی ــــ کولمبس کی طرح نئی دنیا دریافت کرنے کی دھن کبھی میرے جی سے نہ ہٹتی۔

پھوپھی اماں کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ننھے میاں ابھی ابھی دنیا میں آئے تھے، ہمارے گھر کی پہلی کھلائی اب اس قابل نہ رہ گئی تھی کہ وہ بچوں کی دیکھ ریکھ کے ساتھ ساتھ ان کے گو موت کی پھالیاں پوتڑے بھی دھو سکتی، یوں گاؤں تو اپنا ہی تھا۔ چاکروں کی کیا کمی تھی۔ مگر اس دن راگھو چمپا کو لیکر آیا تو دادا جان کو ذرا اعتراض نہ ہوا، جب کہ دادی جان اس قسم کے دھیٹر چماروں کو گھر میں گھسنے تک نہ دیتی تھیں کہ

بچّوں پر بُرا اثر پڑے گا ــــ (ویسے سچ بات تو یہ تھی کہ بچّوں پر تو نہیں البتہ ہمارے ہاں کے بڑوں پر بے حد بُرا اثر پڑا تھا ــــ)

"چمپا گھر آئی تو سب سے پہلے دادی جان نے زوردار طوفان اٹھایا کہ یہ تو حشر تک نہیں ہونے دوں گی ــــ جان جوان لڑکی اور نک سک سے درست اور یوں ہی آوارہ ــــ ہمیں نہیں دھلوانے ایسے پوتڑے ــــ کیا گھر کے دوسرے نوکر مر گئے ہیں ــــ؟" مگر دادا جان نے رسان سے سمجھایا کہ بھئی بیگم وہ بات کچھ ایسی ہے کہ پوتڑے دھلوانے کی تو محض بات تھی، بے چاری غریب ہے، گاؤں میں کال پڑا ہے، باپ پردیس چلا گیا، جائے کہاں بے چاری ــــ میں نے خدا ملے پال لیا ہے سمجھو اسے ــــ ارے بھئی ایسا ہی تمہیں ڈر ستاتا ہے تو اسے گھر کے کام کاج میں گھس پٹ نہ کرنے دیا کرو ــــ وہ اِدھر ہی نوکر خانے میں رہے ـ مرے چھو ہم سے مطلب ــــ؟؟"

چمپا کتنی عجیب آفت کی پرکالہ تھی ــــ لاکھ کوئی بات سمجھاؤ سمجھنے کا نام نہ لیتی ــــ اب مجھے تو دادا جان اور دادی جان کے غصّہ کا علم تھا، میں لاکھ منع کرتی مگر وہ کبھی ننھے میاں کو گود میں بھر لیتی، پیار کرنے سے باز نہ آتی ـ اس حد تک تو میرا کہا ضرور مانا کہ دادی جان کی موجودگی میں گود نہ لیتی ـ وہ اگر دیکھ لیتیں تو اُلٹا ہی ٹنگا دیتیں کہ اب تو وہ زمانہ آگیا کہ موئے چماروں کے پلّے بھی ہمارے بچّوں کو گود لے رہے ہیں ــــ نماز قرآن کی جگہ تو خیر اس کے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا، وہ تو دالان تک بھی نہ آنے دی جاتی ــــ دادی جان تو یوں ہی اسے لتاڑتی رہتیں ویسے بے چاری ایسی بھی تھی چمپا ــــ ایسے دوڑ دوڑ کر کام کرتی کہ ہانپ ہانپ جاتی ـ دھیرے دھیرے اس کے ذمّے کاموں کا ڈھیر لگتا گیا ــــ کہاں تو وہ صرف چھالیاں پوتڑے دھونے

رکھی گئی تھی، یا اب بھینس، مرغیاں، ہرن کبوتر بھی اسی کے ذمے لگ گئے ـــ وہی ان کے دانے چارے کی دیکھ ریکھ کرتی ـــ کبوتروں کو کابک سے نکالتی بند کرتی۔ ہرن کو حوض پر لے جاکر نہلاتی ـــ مرغیوں کو دانہ اور بھینسوں کو چارہ ـــ بیچاری صبح سے شام تک جتی رہتی ـــ اور وقت ملنے پر اکیلے میں ننھے میاں کو اچھالنے لگتی ـــ

"دیکھ چمپا ـــ" میں اسے ڈراتی ـــ "ننھے کو ہاتھ مت لگا۔ دادی جان دیکھیں گی تو جان سے مار ڈالیں گی ـــ" وہ دکھ کے ساتھ بولتی ـــ "بی بی ـــ کیا کروں ننھے کو دیکھ کر مجھے اپنا رحمن یاد آجاتا ہے ـــ" اس کی آنکھیں گیلی ہو جاتیں اور وہ بھیگے بھیگے لہجے میں کہے جاتی ـــ "جب وہ مرا ہے بی بی تو میرا دودھ بھی نہ سوکھا تھا۔ سال بھر کا تو تھا ـــ اس کے مرے پیچھے تو رہ رہ کر جی میں ابال سا اٹھتا تھا اور چھاتیوں سے دھاریں ابلنے لگتیں ـــ"

میں خوف سے اِدھر اُدھر دیکھتی کہ کوئی مجھے چمپا کے پاس کھڑا دیکھ تو نہیں رہا ہے اور نئی نئی باتیں معلوم کرنے کے شوق میں میں اور بھی اس کے پاس گھسی جاتی اور دل سے چاہا کرتی کہ باتوں کا سلسلہ ٹوٹے نہیں مگر کم بخت اس کے آنسو عین موقع پر گڑبڑی کر دیتے۔ اور وہ یونہی دم سادھے چپ رہ جاتی ـــ ہائے بے چاری ـــ میرا دل رحم اور ہمدردی سے بھر جاتا۔ کتنی دکھیاری ہے یہ ـــ خواہ مخواہ میں برا بھلا کہتے رہتے ہیں اسے ـــ مگر ایک دن تو میرا جی بھی چمپا سے ہٹ سا گیا۔ میں نے صاف اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جب وہ بھینسوں کے کوٹھارے میں سے نکل رہی تھی تو پیچھے سے بڑے پھوپھا بھی نکل آئے تھے۔ امّی جان نے یہ تو خیر سمجھا ہی دیا تھا کہ اکیلے میں لڑکوں سے بات تک بھی نہیں کرنی چاہیئے ـــ بری حرکت ہے، پھر یہ چمپا اندھیرے کوٹھارے میں بڑے پھوپھا کے ساتھ کیوں تھی۔؟

میں نے اس سے پوچھ ہی لیا — "یہ کیا حرکت تھی بی چمپا تمھاری —"
اسے تو وہ ذرا نہ جھجکی — صاف کہنے لگی — "بڑے سرکار تو میرے کپڑوں پر دھیان دیتے ہی نہیں۔ جب چھوٹے میاں نے کدھر سے سن لیا اور خود ہی پیسے دینے چلے آئے۔"
میرے دل میں سویا سویا خدشہ جاگنے لگا — ماموں جان کے کمرے میں چوری پوری جو افسانے پڑھے تھے وہ سب دماغ میں کلبلانے لگے — میں نے سچ مچ کی کولمبس بن کر، راز دارانہ لہجے میں پوچھا — "مفت ہی مفت !!!"
وہ اسی انداز سے بغیر جھجک کے بولی — "میمت کا ہے کو مانگ رہے تھے —"
مکا — ! سر سے پیر تک میں لرز گئی — "اور تو نے دے دیا —؟؟ —"
"پھر دنیا میں کون بیچ میمت ملتی ہے —؟؟"
"ہشت بے شرم —" مجھے ادبدا کر غصہ آگیا۔
واقعی دادی جان تو ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ ایسی عورتوں کو گھر میں پھٹکنے بھی نہیں دینا چاہیے — ایسا کیا مجھ سے ایک دوپٹہ مانگ لیتی تو میں دے نہ دیتی —؟؟
ساری ہمدردی اسی لمحہ ختم ہوتی نظر آئی —
ہمارا گھر اتنا بڑا تھا کہ چار براتیں اترتیں تب بھی ہلڑ نہ مچتا — ایسے میں کون کس کی خبر لیتا ہے اگر میں چاہتی تو چمپا کے ساتھ مزے میں رہ سکتی تھی، مگر خود میرا ہی جی اس کی طرف سے میلا ہو گیا — بھئی بڑوں نے جس بات کو کہہ دیا کہ بری ہے پھر اسے اپنانے میں کیا بھلائی ہے —؟؟
یہ تو میں ابھی بھی دیکھتی تھی کہ چمپا ننھے میاں کو چوری چھپے پیار کرتی ہی ہے — کھلائی اسے لے کر باغ میں نکل آتی، ایسے میں بڑا گھر بالکل ہی الگ سا رہ جاتا۔

ادی جان کو کبھی تو چپا کی حرکت کا پتہ نہ چلا — چپا ننھے کو بے تحاشا پیار کرتی اور مزے میں بولتی — "یہ تو میرا رحمن ہے۔"

وہ تو اچھا ہوا کہ میرے ہی دل میں نیکی تھی، ورنہ دادی جان سے جا کہتی تو —! ؟

ہونہہ — ! ننھے میاں کو رحمن کہتے موت نہیں آتی۔ بے شرم کدھر کی —

رفتہ رفتہ چپا کی خوبیاں اجاگر ہونا شروع ہوئیں اور پھر تو ساروں کو پتہ چل گیا کہ وہ کن گنوں کی ہیں — کم بخت کو بکالے بن نہ پڑتا تھا نہ رکھتے — دادا جان کا جلالی خون تھا اور انگریزی حکومت کے دیدبے دیکھے بیٹھے تھے، بڑا رعب تھا ان کا — دل میں سما جاتی تو بھلا کس کی سنتے، مگر انھوں نے خود ہی جان بوجھ کر کان نہ دیئے — "غریب ہے کہاں جائے گی بے چاری — خواہ مخواہ بگڑے دھندے کرے گی —" انھوں نے دادی جان سے مخاطب ہو کر کہا —

میرا دل تو چاہا ابھی کہہ دوں کہ کیا دیکھا تھا، مگر پھر چپ ہو رہی کہ میں کیوں خواہ مخواہ دخل دوں۔ مگر جب کبھی وہ بات یاد آجاتی دل میں نفرت سی بھر جاتی — بھلا عورت کو اتنا بیح ہونا بھی بھلا لگتا ہے —؟؟

مگر میرا غصہ اس لمحے بہتا نظر آیا جب میں نے چپا کو بری طرح اداس اور پریشان دیکھا۔ یوں کہ اس کی آنکھیں سدا بھیگی بھیگی نظر آنے لگیں — میں نے اس دن پرانی بات کو بھلا کر اس سے اداسی کی وجہ پوچھی تو وہ بولی — "ننھے میاں کا جی اچھا نہیں ہے۔"

"کیا ہوا ننھے کو —" میں حیرت سے بولی — "اچھا خاصا تو ہے۔"

"کاہے کو اچھے کھاسے ہیں — دلہن بی بی کا دودھ سوکھ گیا ہے، اوپر کا لگائے ہیں۔ وہ ہجم ہوتا نہیں، اوپر سے پکھانے لگ گئے ہیں — رات بھر تو پوتڑے

بدلنے اور دھونے پڑتے ہیں ——"

"پیچش ہوگئی —— ؟" میں نے ہولا کر پوچھا —— کیونکہ گاؤں میں جب کسی کو پیچش ہوتی جلد اچھی نہ ہوتی۔ کچھ آب و ہوا ہی ایسی تھی۔ مریض ختم ہو جاتا مگر مرض ختم نہ ہوتا۔

"ہاں حکیم جی تو پیچش کا خطرہ بتا کر گئے ہیں ——"

اس دن کے بعد سے میں نے کبھی چمپا کے چہرے پر وہ بشاشت نہیں دیکھی کہ لپک لپک کر کام کر رہی ہے۔ ڈھولکے گنگنا رہی ہے، دوڑ دوڑ کر مرغیوں کو ڈربوں میں بند کر رہی ہے۔ ہرن کے ساتھ اچھل پھاند کر رہی ہے اور کبوتروں کے ساتھ اچک رہی ہے —— سدا ننھے میاں کی پلنگ کی پٹی سے لگی انھیں تکے جاتی۔ اس نے ننھے میں رحمن کا روپ پایا تھا، شاید وہ ڈرتی تھی کہ رحمن کی طرح ننھا بھی اس سے نہ چھن جائے۔

اس دن وہ کھلائی سے کہنے لگی —— "ہو بوا جی —— اپنے بابا جی کو کسی عورت پر کیوں نہیں لگا دیتے ——"

کھلائی نے جلبلا کر چمپا کو دیکھا —— "تیرا مطلب ہے دائی لگالیں ——"

"ہاں ہاں ——" وہ خوش ہو کر بولی —— "یہی تو کہہ رہی ہوں۔"

کھلائی پھنکارتی ہوئی بولی —— "بھلا کیا جو میرے سامنے کہا، اری موئی کبھی نوابوں کے خاندان میں بھی یہ کھوٹ ہوئی ہے؟ کون جانے کس کے دودھ میں کیا اثر ہے —— میں نے تو اس باڑے میں اپنے بال سفید کر لئے مگر آج تک کبھی نہ دیکھا کہ بی بی لوگ کے سوا بچوں نے کسی اور عورت کا دودھ پیا ہو —— ایسی بات سوچی بھی کیسے تو نے ——؟"

چمپا کا چہرہ اتر گیا —— وہ ایک لفظ بھی نہ بولی —— ڈھیرے سے گندے پوتڑے اٹھائے اور حوض کو چل دی ——

اس رات کو میں نے ابن چچا سے جن بھوت کی کہانی کیا سنی کہ نیند ہی اڑ گئی

چودہ پندرہ برس کی لڑکی اب اتنی ڈرپوک بھی نہیں ہوتی، مگر اس کا کیا علاج کہ ہمارا گھر

کم بخت اتنا بڑا اور ڈھنڈار تھا کہ ہر کونے سے بھوت اور جن اترتے۔ اللہ اللہ دیتے تھے۔

میں نے اپنا لحاف اور تکیہ اٹھایا اور ڈرتے ڈرتے کھلائی کو پکارا ـــ گھر کی اس

وقت ننھے میاں کو سنبھال رہی تھی جنھوں نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اور چمپا

جھولے کے پاس مری مری سی بیٹھی تھی ـــ میرے پکارنے پر کھلائی آئی تو میں نے دیکھا

کہ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں ـــ "بے چاری بڑھیا ـــ" میں نے رحم سے سوچا۔

"تم سو کیوں نہیں جاتیں بوا ـــ" میں ذرا چڑ کر بولی ـــ " اور کوئی سنبھالنے والا

نہیں کیا ننھے کو ـــ!"

چمپا تیزی سے اٹھ کر آئی اور بولی ـــ "بی بی کتنی دیر سے بول رہی ہوں کہ سو جاؤ

پر سنتیں نہیں ـــ میں تو جگ رہی ہوں۔"

"ڈر کے مارے مجھے بھی نیند نہیں آ رہی ہے بوا ـــ" میں اسے سمجھانے کے انداز

سے بولی ـــ "تم سو جاؤ، میں اور چمپا اسے دیکھے لیتے ہیں ـــ"

میں نے ننھے کو لے لیا ـــ لے ہے ـــ بس پھول کی طرح ہلکا، و بلا تانت ہو کر

رہ گیا تھا ـــ "یقیناً جلد ہی مر جائے گا۔" میں نے دل میں سوچا ـــ

دو چار الٹے سیدھے جھکولے دینے پڑی میں تھک سی گئی اور نیند محسوس کرنے

لگی ـــ اسے چمپا کے حوالے کر میں وہیں پلنگ پر اپنا تکیہ رکھ لیٹ گئی اور لحاف

لپیٹ لیا ـــ

ننھے کی چیں چیں رہ رہ، ختم ہونے میں ہی نہ آتی تھی کہ مجھے نیند لگ سکتی ـــ

کھلائی البتہ مزے سے سو رہی تھی ـــ چمپا بڑی تندہی سے ننھے کو سنبھال رہی تھی۔

مگر سنبھلتا ہی نہ تھا۔ چمپا اپنے آپ میں بڑبڑائے جا رہی تھی ـــــ

" کیا اندھیر ہے کہ ماں کا دودھ سوکھ گیا ہے تو اوپر کا ہی پلائیں گے ـــ آکھر دوسری عورت کا پلانے میں کیا بگڑتا ہے ـــ ہونہہ دودھ، دودھ میں بھی شاید پھرک ہوتا ہے ـــ بچے بچے تو سبھی برابر ـــ مائیں بھی برابر ـــ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ـــــ ایسا کیا کھون کو لیکر چلنا کہ بچے کی جندگی پر ہی بن جائے ـــ اور بچہ تو اوپر کا دودھ منہ میں پکڑتا نہیں ـــ مر نہ جائے ـــ "

اکدم وہ خود ہی چونکی ـــ "ہائے میں کیا بول گئی ـــــ مریں اس کے دشمن ـــ میرا ارجن ہے یہ تو ـــ " اور ایسا کہہ کر اس نے زور سے ننھے کو بھینچ لیا ـــ چیختا ہوا ننھا اس کے سینے سے لگ کر یکبارگی چپ ہو گیا ـــ چمپا کتنی ہی دیر اسے یونہی چمٹائے رہی اور میں نے صاف دیکھا کہ چمپا کی آنکھیں ابل رہی ہیں ـــ سینے سے لگے لگے ننھے نے منہ سے کچھ ٹٹولنا شروع کیا اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ چمپا نے بالکل پھوپی جان کی طرح ننھے کے منہ سے دودھ لگا دیا ـــــ

اب چمپا کے چہرے پر ایسا اطمینان، ایسی خوشی، ایسی مسرت برس رہی تھی جسے میں دیکھ تو سکتی تھی مگر بیان نہیں کر سکتی ـــــ اتنے دن گذر جانے پر آج بھی مجھے الفاظ نہیں ملتے ـــ اس نے ننھے کا سر سہلانا شروع کیا۔ اور ننھے نے دودھ سے منہ ہٹا کر چمپا کے چہرے کو دیکھا تو اسی ایک لمحے میں میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ چمپا کی چھاتی سے دودھ کی دھار بہہ رہی ہے ـــ !!

دودھ ـــــ یہ دودھ کہاں سے آیا ـــــ ؟ لاکھ بچی تھی مگر اتنی سمجھ تو بہرحال مجھے تھی کہ دودھ صرف بچے والی عورت کے ہی ہوتا ہے ـــ پھر ـــ پھر یہ چمپا ـــ ؟ اس کے تو کوئی بچہ نہ تھا۔ ایک تھا تو دن ہوئے مر گیا تھا ـــ پھر ـــ ؟ ـــ پھر ـــ ؟ ـــ

اور اسی پھیر پھیر کے چکر میں جانے کب میری آنکھ لگ گئی ——

دوسرے دن ننھے میاں کے چہرے پر نہ صرف بشاشت نظر آ رہی تھی بلکہ ان کی پیچش میں بھی کمی تھی —— حکیم جی اپنی حکمت پر اترا رہے تھے۔ اور ملا جی اپنے دم کئے پانی کا واسطہ دے رہے تھے۔ ادھر گھر بھر کا مارے خوشی کے برا حال تھا۔ کیونکہ پھوپھا میاں کو پانچ لڑکیوں پر یہ پہلا بیٹا ہوا تھا۔ جس کے جینے کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اور آج کئی دنوں بعد پھر سے جس کی زندگی کی آس بندھ چلی تھی ——

اور پھر تو یہ ہوا کہ دس بارہ دنوں کے اندر ہی اندر ننھے میاں کے گال سیب بن گئے۔ پیچش، بخار، رونا دھونا سب ہوا ہو گیا۔ یہ تو ہوا ہی ہوا اِدھر چمپا کے چہرے پر بھی بھاگ برسنے لگا —— وہ مرگھنی گائے جیسی تھی یا اب اکدم چوکڑیاں بھرتی ہرنی کی طرح طرار ہو گئی ——

اور پھر ایک دن یہ ہوا کہ ننھے میاں کسی بات پر مچل کر دھان دھوں رونے لگے تو چمپا کا جی بھی اپنی جگہ سے اکھڑ گیا۔ پتہ نہیں ننھے کو روتا دیکھ اسے کیا ہوا' (میں آج تک نہیں سمجھ پائی) کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنا سینہ پکڑ لیا اور تھوڑی دیر میں چھل چھل کرتا دودھ اس کی چولی پر ابھر آیا —— یہ اتنی عجیب اور نمایاں بات تھی کہ کسی سے چھپی نہ رہ سکی —— سب نے گھبرا کر، کچھ حیرت سے، کچھ غصّے سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا —— دادی جان قیامت کی نظریں رکھتی تھیں بولیں "یقیناً اس نے کسی بچّے کے منہ میں اپنی چھاتی دی ہوگی ——"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے ——" مومانی جان بولیں —— "پڑتا کیسے نہیں —— سوکھا دودھ ابل پڑتا ہے ——" اکدم وہ چمپا پر تل گئیں —— "کیوں ری قطّامہ —— کیا کیا ہے تو نے —— بول —— !"

اتنی ساری آنکھیں اس پر گڑ گئیں کہ اسے جائے فرار نہ ملی۔ سچ بول دینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا ـــ وہ رسان سے بولی۔

"ننھے میاں کو دودھ پلایا ہے میں نے ـــ"

"ننھے میاں کو ـــ ؟!"

"ننھے میاں کو ـــ ؟"

"ننھے میاں کو ـــ ؟"

گھر بھرے میں شور و غوغا مچ گیا ـــ ہائے اس چھنال کا دودھ پی کر اب ننھے میاں کی زندگی کا کیا ہے گا ـــ خون تو اثر دکھائے گا ہی ـــ مگر اس نے یہ کیا ہی کیسے ـــ اس چھنال بدچلن کی یہ ہمت ؟!

"مجھ سے ان کا رونا نہیں دیکھا جاتا تھا ـــ مجھے تو وہ اپنے بچے جیسے ہی لگتے ہیں ـــ ہاں بھگوان کی قسم ـــ بھلا ایک عورت کو مالک نے دودھ دیا ہی کیوں ـــ بچے ہی کے لیے نا۔ پھر میں کیسے ان کا رونا دیکھتی ـــ ؟"

انصاف کی گھنٹی ہلائی گئی ـــ دادا جان اپنی شاہانہ کرسی پر دبدبے کے ساتھ رونق افروز تھے ـــ ان کے نتھنے مارے غصے کے پھڑک رہے تھے ـــ اور منہ میں کف آیا جا رہا تھا ـــ گرج کر انھوں نے منشی جی سے کہا ـــ

"کلو قصاب کو بلا لاؤ ـــ"

کلو آیا تو وہ مڑے اور پاٹ دار آواز میں بولے۔

"اس حرامزادی کی چھاتیاں کاٹ کر پھینک دو ـــ"

آزادی کے آنسو

"سلمیٰ ذرا میری نکٹائی تو دینا ــــ"

"سلمیٰ میرے پین میں سیاہی ڈال دی ــــ"

"اوہ ــــ میرا جوتا کدھر رکھ دیا بھئی ــــ"

"دیکھنا ذرا یہ ٹائی ٹھیک بندھی ــــ"

"ممّی ہمارا ٹفن یاد سے بھیجنا ــــ"

"سلمیٰ دیکھنا ببلو کو دوا یاد سے پلا دینا ــــ"

"ممّی سالن تیز مت بھیجنا ہمارا منہ جلتا ہے ــــ"

سلمیٰ ــــ ممّی ــــ اور ممّی سلمیٰ ــــ

ایک ہندوستانی کی زندگی بھی کس قدر مصروف ہوتی ہے۔ اور یہ مصروفیت صبح سے لیکر دس بجے تک اور شدید ہو جاتی ہے۔ شوہر کے آفس جانے کا ٹائم۔ بچوں کے اسکول جانے کا ٹائم۔ شوہر صاحب ٹائی مانگ رہے ہیں۔ جوتے کے لئے واویلا مچا رہے ہیں، پھر اپنے جگر گوشوں کی بیماریوں پر نگاہ رکھنے کو کہہ رہے ہیں۔ بچے اپنے ٹفن کی یاد دہانی کروا رہے ہیں۔ سالن کے تیز ہو جانے کی فریاد کر رہے ہیں ــــ

اور پھر جب شوہر صاحب غصّہ میں چلے جاتے ہیں اور بچّے اسکول ــــ تو گھر خالی خالی سا ہو جاتا ہے اور ہماری فضا پر ایک سکون سا چھا جاتا ہے ــــ میری چھوٹی سی دنیا ــــ چھوٹی سی حسین زندگی ــــ چھوٹا سا گھر ــــ میرے پیارے چار بچّے ــــ محبّت کرنے والا شوہر ــــ اور میں ــــ اپنے پیارے بچوں کی پیاری ماں ــــ اپنے شوہر کی فرمانبردار بیوی ــــ میری حسین زندگی !!

انھیں آفس، اور جاوید کو اسکول روانہ کر دینے کے بعد میں نے سکون کی سانس لی۔ اور پلنگ پر لیٹ گئی۔ سردیاں آ رہی تھیں ــــ ننھّے کے لئے موزے بُننے تھے ــــ پاس پڑی میز پر اون اور سلائیاں رکھی تھیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر انھیں اٹھا لیا اور نٹنگ شروع کر دی ــــ

"دھائیں ــــ لو بھئی مر گیا تمہارا بادشاہ ــــ" اسلم نے فاتحانہ انداز میں سینہ تانا ــــ

"ام بھی تمارے باچھا کو مالیں گے ــــ" ربی آسانی سے ہار ماننے تیار نہ تھی۔

"کیوں مارو گی بھلا" ــــ ؟

"تم نے کیوں مالا" ــــ ؟

"وہ ظالم تھا" ــــ

"دالم تھا ــــ (ظالم کیا؟)

"یعنی بہت خراب تھا" ــــ

"پھل اب ام تیا تلنا" ــــ

"ہمارے بادشاہ کے پاس آجاؤ" ــــ

"پھل مالنے آتے پہچھے لوروں کو تھانا دے دا تمالا باچھا۔ دپھر ہمارے اتنے

بہت سے لوگوں کو کھانا دے سکا تمہارا بادشاہ)

"ہمارا بادشاہ بہت رحم دل ہے ـــــ وہ تمہیں بھی اور سب کو بھی کھانا دے سکتا ہے۔ سمجھیں "ـــــ؟

"آؤ چل دوستی کر لیں "ـــــ

ماچس کی تیلیوں کے سپاہی دوسرے بادشاہ کی رعایا بن گئے ـ ایک ادھ جلا سگریٹ ایک چھوٹے سے پتھر کے ٹکڑے پر لگا دیا گیا تھا۔ جو بادشاہ سلامت کا فریضہ انجام دے رہا تھا ـــــ دوسری رعایا کو مخالف سپاہیوں نے بڑی خوشی سے خوش آمدید کہا ـ بادشاہ سلامت نے سلامی لی اور تقریر شروع کی ـــــ آج ہم بہت خوش ہیں کہ تم نے ایک ظالم بادشاہ ......

ببلو ـــــ میں پوچھتی ـــــ تمہیں اسی لئے اسکول سے چھٹی دلائی گئی ہے آج ـــــ؟ بیماری کا بہانہ اسی لئے کیا تھا ـــــ!

تقریر رک گئی ـــــ وہ بے باکی سے بولا ـــــ

"بستر پر لیٹ کر کیا کریں ممی "ـــــ؟

یہ الٹے سیدھے کھیل کیا کھیل رہے ہو ـــــ کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ یہ جنگ اور لڑائی کے کھیل نہ کھیلا کرو ـــــ نہرو ـــــ اب میں تمہارا طمنچہ ہی چھینے لیتی ہوں ـــــ پھر دیکھوں گی کہاں سے گولیاں چلاتے ہو ـــــ چلو جاؤ روبی کو الگ کھیلنے دو ـــــ خود تو.........

روبی نے میری بات کاٹ دی ـــــ اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو جھپکا کر بولی ـــــ نائیں ممی ـــــ! ہم ان کے ساتھ اچھا چھے دوستی ہو رہی ہم بوت اچھا کھیل لیے ہیں ـــــ"

"دوستی — دشمنی — بس یہی کھیل آتے ہیں تمھیں — گڑیا گڈے کا کھیل کیوں نہیں کھیلتے تم لوگ —"

بلو میرے پلنگ کی پٹی کے پاس آکر بیٹھ گیا — ممی ہم کو گڑیا گڈے کے کھیل ذرا نہیں اچھے لگتے — ممی آپ نے جو کہانی سنائی تھی نا ظالم بادشاہ کی — جو لوگوں پر ظلم کرتا تھا — جس کی رعایا بھوکی مرتی تھی مگر وہ رحم نہیں کرتا تھا ان پر — اور جو دوسرا بادشاہ تھا جو بہت اچھا تھا۔ اس نے ظالم بادشاہ کو مار کر دوسری رعایا کو بھی مصیبت سے بچا لیا تھا — تو ممی ہم وہی کھیل تو کھیل رہے تھے" —

"بلو — تم اتنے چھوٹے ہو کر کیسی کیسی باتیں کر جاتے ہو — تم سے تو میں بہت ڈرتی ہوں بھئی — اور تم یہ ہمیشہ اپنی قمیص کے کاج میں سرخ پھول کیوں ٹھونسے پھرتے ہو — میں نے اس کا پھول کھینچ کر دور پھینک دیا اگر کوئی مصیبت آگئی اور میں —"

اس نے دوڑ کر پھول اٹھا لیا — بات کاٹ کر بولا — ممی — ہمارا پھول کیوں پھینکتی ہیں آپ — آپ خود تو کہتی ہیں کہ سرخ گلاب اچھے ہوتے ہیں — اور یہ آپ کے جوڑے میں تو دیکھئے —

مجھے خیال آیا کہ بچوں کو ایسے کام کے لئے منع نہیں کرنا چاہئے جو ہم خود کرتے ہیں — میں بات ٹال کر بولی — جاؤ الگ کھیلو — لڑو بھڑو نہیں۔ — تم لڑکے ہو کر بھی رو بی —

"چھوٹی بیگم دو بجے کے لئے کیا پکے گا" — بیچ میں ایکدم بوڑھی ملا کی آواز آئی جب میں اپنے بچوں کو کہانی سناتی رہتی ہوں — ان سے پیاری پیاری باتیں

کرتی ہوں ــــ اپنے شوہر کے ساتھ خوش گپیاں کرتی ہوں اگر اس وقت کہیں سے اس بوڑھی ماما کی آواز آجاتی ہے تو میرا جی جل اُٹھتا ہے ــــ وہ منحوس بوڑھی کھوسٹ ــــ پتہ نہیں کب سے ہمارے گھر میں نوکری یا صحیح لفظوں میں حکومت کرتی چلی آرہی تھی ــــ میں نے تو جب سے آنکھ کھولی تھی اس بڑھیا کو ہی دیکھا تھا ــــ امی کے زمانے میں بھی وہی نوکر تھی۔ امی کی امی کے زمانے میں بھی وہی تھی ــــ اور اب میرے اور میرے بچوں کے زمانے میں بھی وہی منحوس بڑھیا راج کر رہی تھی ــــ کہتے ہیں کہ دو پیسے کی جھاڑو خریدتے ہیں تو اس کا بھی شگون دیکھتے ہیں ــــ پھر یہ تو اتنی بڑی پہاڑ جیسی عورت تھی ــــ یہ جب سے ہمارے خاندان میں نوکری کرنے آئی تھی تب ہی سے ہمارے خاندان پر کچھ نہ کچھ مصیبتیں نازل ہوتی چلی آرہی تھیں ــــ کئی نوکر اور مامائیں رکھی گئیں مگر بڑھیا اپنی لڑاکا اور حکومت پسند تھی کہ کسی کو ٹکنے نہ دیا۔ سیاہ رنگ۔ بڑے بڑے دانت اور چیچک کے داغوں والی وہ گندی بڑھیا جس کی آنکھوں میں ہمیشہ پانی بھرا رہتا ــــ جس کے کپڑے ہمیشہ گندے اور کیچڑ میں لت پت رہتے۔ منحوس اتنی کہ اکثر صبح ہی صبح اس کا چہرہ دیکھ لو تو دن روتے ہی گذر جائے۔ اسی لئے میں گھر کے بڑے کمرے میں اپنے بچوں اور میاں کے ساتھ سب دروازے بند کر کے سوتی تھی کہ صبح اٹھیں تو ہم ایک دوسرے کی ہی صورتیں دیکھیں ــــ

میں نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا ــ وہ اپنا منحوس چہرہ لئے کھڑی تھی۔

"مٹر کی پھلی کئی دنوں سے نہیں آئی اور یہاں آلو گوبھی منگوا لینا اور دیکھو مرچ زیادہ نہ ڈالنا جاوید شکایت کرتا تھا"ــــ

وہ اپنی ازلی ہٹ دھرمی برتتے ہوئے بولی ــــ "میں تو ٹماٹر لاؤں گی اور

سیم کی پھلی ـــ مٹر کی پھلی اچھی نہیں ہوتی ـــ کم مرچ سے سالن کا مزہ جاتا رہتا ہے ـــ"

"بڑی بی ـــ میں چیخی ـــ مجھ سے پوچھا ہی کیوں تھا پھر ـــ خود ہی لے آتیں ـــ" وہ بے حیائی سے ہنسنے لگی ـــ اس کے بڑے بڑے غلیظ دانت ـــ میری توبہ! "دیکھو تم حد سے زیادہ بڑھتی جا رہی ہو۔ مالکن میں ہوں، تم نہیں، میں جو کہتی ہوں وہ کرو ـــ مجھے لگتا ہے کہ اب تمہیں برطرف کرنا ہی پڑیگا. یاد رکھو اسی وقت چٹیا پکڑ کر باہر نکال دوں گی"ـــ

"وہ ہنستی ہوئی چلی گئی ـــ بڑے بڑے نکیلے دانت جو بڑھاپے میں بھی سلامت تھے۔ ایسی ہنسی جو میرا مضحکہ اڑا رہی تھی ـــ جیسے ـــ "بہت دیکھے برطرف کرنے والے۔ تمہاری کیا اوقات ہے مجھے نکالنے کی۔"

میں دانت کچلیا کر رہ گئی ـــ

اور یہ صرف آج کی بات نہ تھی۔ بڑھیا بڑی خودسر تھی ـــ ہمیشہ وہی کام کرتی جو اس کے دل میں ہوتا ـــ یوں بڑائی دینے کو مجھ سے پوچھ لیتی ـــ مگر پوچھنے کے بعد ہمیشہ میری بات میں ردوبدل کر دیتی ـــ میں ہر بار سوچتی کہ اب سے خود ہی ایسے کوئی کام نہ بتاؤں گی۔ ـــ کوئی بات پوچھے گی بھی تو چپ رہ جاؤں گی۔ مگر میں کبھی ایسا نہ کر سکی ـــ ایک بڑھیا کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنی ناچ رہی تھی ـــ اس نے کبھی بھی مجھے مالکن کا درجہ نہ دیا ـــ میں کیوں اتنی بے بس تھی ـــ باوجود ہزار کوششوں کے بھی میں اسے نہ نکال سکی ـــ سچ تو یہ ہے کہ اسے نکالنے کی مجھ میں ہمت ہی نہ تھی ـــ "ان" میں بھی نہ تھی ـــ ہم سب کتنے مجبور تھے۔ میری چھوٹی سی حسین زندگی میں لے دے کے یہ بڑھیا ہی تھی جو

ایک کانٹے کی طرح کھٹکتے رہتی تھی ـــــ خدا کو میری یہ حرکت ضرور بُری لگی ہوگی لیکن میں اپنی غلطی کا اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے کئی بار گڑگڑا کر دعائیں مانگیں کہ اللہ تو اس بڑھیا کو موت دیدے یا یہ نہیں تو اسے اتنی توفیق تو دے کہ وہ میرا گھر ہی چھوڑ دے۔ مگر دونوں دعاؤں میں سے ایک بھی پوری نہ ہوئی ـــــ مگر آج تو میں نے سوچ لیا چاہے کچھ ہی ہو جائے اس نحوست کی پڑیا کو کسی نہ کسی طرح نکال پھینکنا ہی ہے۔

اور پھر اسی طرح کئی ماہ گذر گئے ـــــ میرے گھر ایک اور ننھی مُنّی سی گڑیا نے جنم لیا ـــــ بالکل اپنے باپ کی چھوٹی سی شبیہہ ـــــ

صبح کا وقت تھا ـــــ وہ آفس جا چکے تھے ـــــ اسلم اور جاوید اسکول چلے گئے تھے ـــــ روبی اور ٹونی میرے پلنگ کے پاس ہی بیٹھے کھیل رہے تھے کہ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی ـــــ میں ننھی کو دودھ پلا رہی تھی ـــــ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے آواز دی ـــــ

"کون ہے آجاؤ" ـــــ

دروازہ دھیرے سے کھلا اور ایک نوجوان لڑکی داخل ہوئی ـــــ شرماتی لجاتی ـــــ کچھ گھبرائی گھبرائی سی ـــــ اس کے جسم پر ایک ڈھیلا ڈھالا لبادہ تھا جو جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا ـــــ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے عجیب قسم کی بے اطمینانی جھانک رہی تھی ـــــ گھونگھر والے بال چہرے پر بکھر کر اس کی گھبراہٹ اور حُسن میں مزید اضافہ کر رہے تھے ـــــ

میں اسے دیکھ رہی تھی اور وہ مجھے دیکھے جا رہی تھی ـــــ

"کون ہو تم" ـــــ آخر میں نے ہی خاموشی توڑی۔

www.taemeer.pk

"میں ــــ میں جو کوئی بھی ہوں ــــ مگر آپ کے پاس آئی ہوں" ــ اس نے بہت ہی میٹھی آواز سے کہا ــــ

"میرے پاس ــــ؟ مگر کس لئے" ــــ

"نوکری کرنے" ــــ

میرے دماغ میں ایکدم بڑھیا کی شکل اُبھری" ــــ "میں ضرور رکھ لیتی مگر ــــ" اور میں چپ رہ گئی ــــ

"مگر کیا" ــــ؟ وہ بے تابی سے بول اٹھی ــــ

"میرے پاس جو بڑھیا ماما ہے نا وہ تمھیں ہرگز نہیں ٹکنے دے گی۔ بڑی لڑاکا ہے وہ بڑھیا ــــ

"لڑاکا بڑھیا" ــــ؟ وہ کچھ حیرت سے بولی ــــ

"ہاں ہاں ــــ میری جو ماما ہے نا ــــ بہت جھگڑالو بڑھیا ہے کسی ملازم کو ٹکنے نہیں دیتی" ــــ

وہ اطمینان سے بولی ــــ" وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی ــــ آپ مجھے رکھ تو لیجئے" ــــ

"تم نہیں جانتیں بڑی خراب ہے وہ بڑھیا ــــ کئی پشتوں سے وہ ہمارے گھر راج کرتی چلی آ رہی ہے ــــ ہم اُس کے ہاتھوں لٹو بنے گھوم رہے ہیں ــــ تمھیں کیا ٹکنے دے گی بھلا وہ" ــــ؟

اس کی آنکھیں ایک لمحے کو چمکیں ــــ "کئی پشتوں سے؟" پھر وہ جلدی سے بولی ــــ اچھا وہ بڑھیا ــــ آپ سے زیادہ میں جانتی ہوں اُسے ــــ آپ میری بات سنئے ــــ مجھے رکھ تو لیجئے" ــــ

"اچھا بھئی ـــ میرا کیا جاتا ہے ـــ مجھے تو یوں ہی ایک ملازمہ کی ضرورت تھی۔ مگر تم پورے گھر کا کام کر سکو گی" ـــ؟

وہ ذرا مسکرائی ـــ اس نے اپنے سفید سفید ملائم ہاتھ میری طرف بڑھا دئے ـــ "ان ہاتھوں سے میں نے کئی بچے پالے ہیں ـــ ان ہاتھوں نے کتنے جہنم نما گھروں کو جنت بنا دیا ہے" ـــ "مگر یہ تمھارے ہاتھوں پر زخم کے نشان کیسے ہیں ـــ اور تمھارے چہرے پر کچھ خراشیں بھی ہیں" ـــ

وہ کربناک آواز سے مسکرائی ـــ "بڑے عجیب لوگ ہیں ـ میری آمد کا بڑی طرح انتظار کر رہے تھے۔ عید کے چاند کی مانند راہ دیکھ رہے تھے مگر جب میں آئی ـــ جب میں آئی ـــ اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں ـــ تو انہوں نے میری صورت مسخ کر ڈالی۔ میرا لباس تار تار کر ڈالا ـــ مجھے زخمی کر ڈالا ـــ ظالم کہیں کے" ـــ

"کون لوگ تھے وہ" ـــ میں ہمدردی سے بولی ـــ

وہ طنزیہ انداز سے بولی ـــ "آپ ہی کے برادری کے لوگ تھے ـــ میرا لباس دیکھتی ہیں ـــ بڑا خوبصورت اور چمکدار تھا۔ میرے بال دیکھے آپنے ـــ سونے کے لچھے جیسے تھے۔ میری آنکھیں دیکھیں آپنے ـــ پہلے یہ سدا مسکراتی رہتی تھیں۔ اور میرا سراپا دیکھا آپ نے ـــ پھولوں بھری ڈال کیسے ہوا کے جھونکوں سے لچکتی ہے ـــ ایسی لچکتی تھی میں ـــ مگر اب میری صورت مسخ ہو گئی ہے ـــ

اور میں نے پہلی بار نظر بھر کر اسے دیکھا ـــ واقعی اس کا لباس سفید ریشم کا تھا ـــ چمکیلے ریشم کا ـــ جس پر جگہ جگہ بڑے بڑے نیلے پھول ابھرے ہوئے تھے ـــ مگر وہ جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا ـــ اس کے سنہرے بال ـــ بڑی بڑی ادھ کٹی

آنکھیں ـــ سڈول ہاتھ پیر ـــ کتنا حسین سراپا تھا ـــ میں مدہوشی میں بولی ـــ
"کتنی حسین ہو تم اب بھی" ـــ

وہ اپنے پتلے پتلے سُرخ ہونٹوں کو سکوڑ کر ذرا سا مسکرائی ـــ

" اگر آپ مجھے پہلے دیکھ لیتیں تو جانے کیا کہتیں جبکہ میں یہاں نہیں آئی تھی " ـــ

" تو یہاں آنے سے پہلے تم کہاں تھیں " ـــ میں پوچھ بیٹھی ـــ

" میں ـــ وہ حیرت سے بولی ـــ میں پتہ نہیں کہاں تھی ـــ مگر یہ ضرور ہے کہ جہاں کہیں بھی تھی بہت آرام سے تھی ـــ آپ کا یہ دیش !"

وہ نفرت سے ناک سکوڑ کے رہ گئی ـــ

" مگر میں تمہارا نام تو پوچھنا بھول ہی گئی " ـــ

" میرا نام ـــ وہ کچھ رکی ـــ کیوں نام بتانا بہت ضروری ہے کیا" ـــ

میں کچھ نہ بولی ـــ

وہ مسکرائی ـــ مجھے تمہارے دیش والوں نے اتنا ستایا ہے کہ مجھے تمہارے دیش سے نفرت سی ہونے لگی تھی ـــ مگر پھر بھی مجھے تمہارا دیش پسند ہے ـــ تم پسند ہو ـــ اور اب جب کہ میں تمہارے گھر ـــ تمہارے دیش آ ہی چکی ہوں تو کبھی بھی نہیں جاؤں گی یہاں سے ـــ ہمیشہ یہیں رہوں گی ـــ حیرت ہے آپ نے مجھے اب بھی نہیں پہچانا ـــ اور نام کا کیا ہے ـــ جس نام سے بھی آپ پکار لیں ـــ وہ بڑی صاف دلی سے ہنس پڑی " ـــ

" تو تم ہمیشہ یہیں رہو گی " ـــ

ہاں ہمیشہ یہیں رہوں گی ـــ تم نے مجھے ستایا ضرور ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اتنا تو مجھے یقین ہے کہ جس طرح مجھے تم لوگوں سے پیار ہے تمہیں بھی مجھ سے

پیار اور محبت ہے ـــــ وہ اور کچھ نہیں محض ایک دیوانگی کا لمحہ تھا جب مجھے ستایا گیا تھا ـــــ بہرحال اب تو میں ہمیشہ یہیں رہوں گی ـــــ

" تم ہمیشہ کے لئے رہو گی ـــــ میری بڑھیا ماما بڑی لڑاکا ہے ـــــ میں سہم سی گئی ـــــ سامنے چاول کا سوپ اٹھائے بڑھیا چلی آ رہی تھی ـــــ

چھوٹی بیگم چاول کتنے ـــــ

ابھی اس نے منہ کا جملہ بھی پورا نہ کیا تھا کہ اس کی نظر پاس کھڑی لڑکی پر پڑی ـــــ چاول کا سوپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا ۔ سارے چاول زمین پر بکھر گئے ـــــ

" تو تو یہاں بھی آن مری ـــــ بڑھیا ایسے انداز سے بولی جیسے وہ اس لڑکی کو پہلے سے ہی جانتی ہو ـــــ

لڑکی کچھ نہ بولی ـــــ بڑے پیارے انداز سے مسکراتی رہی ـــــ

بڑھیا کی بھویں چڑھ گئیں ـــــ غصہ کے مارے اس کا ڈراؤنا چہرہ اور بھی ڈراؤنا ہو گیا ـــــ " چھوٹی بیگم میرا حساب صاف کر دیجئے اب اس گھر میں میرا گذارہ نہیں ہو سکتا ـــــ "

یا خدا یہ بڑھیا کے الفاظ تھے ـــــ !! مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا ـــــ میں اسے حیرت سے دیکھنے لگی ـــــ

بڑھیا جانے لگی تو غصے سے لال پیلی تھی ـــــ جاتے جاتے وہ دروازے میں رکی اور اس لڑکی کو مخاطب کر کے بولی ـــــ " مجھے تو نکالا ہے مگر یاد رکھ تجھے بھی چین سے نہ رہنے دوں گی " ـــــ

میں نے محسوس کیا وہ لڑکی کچھ سہم سی گئی ـــــ مگر دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر وہی معصومیت برس رہی تھی ـــــ اس نے روبی کو بڑے پیار سے بلایا ـــــ روبی پہلے تو

شرمائی بھر اپنی بڑی بڑی آنکھیں جھپکاتی اس کی گود میں چڑھ گئی ۔۔۔

" معلوم ہوتا ہے تمھیں بچوں سے بہت پیار ہے "۔۔ میں اسے روی کو بے تحاشا پیار کرتا دیکھ کر بولی ۔۔۔

" ہاں ۔۔۔ وہ ہنسی ۔۔۔ مجھے بچوں سے بہت پیار ہے ۔۔۔ مجھے زندگی سے پیار ہے ۔ زندگی بڑی حسین ہوتی ہے ۔ مجھے پھولوں سے پیار ہے ۔ پودوں سے پیار ہے ۔ دنیا کی ہر چیز سے پیار ہے ۔ مجھے دنیا بڑی اچھی لگتی ہے ۔ مجھے مسکراتے چہرے بڑے بھلے لگتے ہیں ۔ میں خود ہمیشہ ہنستی رہتی ہوں ۔ کتنی ہی مصیبت آئے کبھی نہیں روتی ۔ جب آپ کے دلیش میں میری درگت بنائی گئی تھی ۔۔۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا ۔۔۔ تب بھی میں نہیں روئی تھی ۔۔۔ صرف چیختی اور چلاتی رہی تھی ۔۔۔ آنسو زندگی کی خوشیاں چھین لیتے ہیں ۔۔۔ اور مجھے زندگی سے کتنا پیار ہے کتنا لگاؤ ہے ۔۔ نہیں ۔۔۔ میں کبھی نہیں روؤں گی "۔

یہ تو بڑی اچھی بات ہے ۔۔۔ میں خوش ہو کر بولی ۔۔۔ مجھے بھی سدا ہنستے مسکراتے رہنا بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے ۔۔۔ اچھا ۔۔۔ میں اٹھتے ہوئے بولی ۔ اب تم ذرا نہا دھو کر کپڑے بدل ڈالو ۔۔۔ دیکھو تو تم کتنی تھک سی گئی ہو "۔۔۔

" نہیں ۔۔۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ۔۔۔ میں کپڑے نہیں پہنوں گی "۔

" کیوں "۔۔۔ میں حیران رہ گئی ۔۔۔ تم کپڑے کیوں نہیں پہنوگی ۔۔۔ ایسے ہی پھٹے لباس سے رہو گی "۔۔۔ ؟

" آپ کے کپڑے میرے بدن پر نہیں سجیں گے ۔۔۔ میرا لباس وہی ہاتھ تیار کریں گے جنھوں نے اسے تار تار کیا ہے ۔۔۔ چمکدار سفید ریشمی لباس ۔۔۔ جس پر بڑے بڑے نیلے پھول ہوں گے ۔۔۔ لباس وہی لوگ مہیا کریں گے جنہوں نے ......

میں اس کی بات کاٹ کر بولی ــــ "مگر کب آئیگا تمھارا یہ لباس ؟"
وہ مسکرائی ــــ یہ تو وقت ہی بتا سکے گا ــــ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ لباس آج نہیں کل ــــ کل نہیں پرسوں ــــ اور پرسوں نہیں تو کبھی نہ کبھی ضرور مجھے مل جائیگا۔
ــــ یہ میرا ایقان ہے ــــ میرا ایمان ہے ــــ یہ زندگی کی پکار ہے ــــ اور مجھے امید ہے کہ میرا یقین ایک دن ضرور حقیقت بن کر میری آنکھوں کے سامنے آئے گا ــ !

" ارے یہ کون ہے "ــــ وہ چائے لے کر آئی تو ارشد حیرت سے بولے ــــ
" یہ ــــ میں نے ہنس کر کہا ــ آج ہی آئی ہے نوکری کرنے "ــــ
" نوکری کرنے ــــ ؟ وہ اور زیادہ حیرت سے بولے ــــ اس کی صورت اتنی اچھی ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہ نوکرانی ہو سکتی ہے ــــ خاصی خوبصورت ہے ــــ
" یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بڑھیا نے ہمیں جتنا ستایا ہے اس کا ازالہ کرنے اللہ میاں نے اسے بھیج دیا ہو ہمارے لئے "ــــ
" تو بڑھیا چلی گئی کیا "ــــ وہ کپ پٹخ کر حیرت سے بولے ــــ
"ہاں ــــ وہ تو اس کی صورت دیکھ کر ایک منٹ بھی نہ ٹھیری ــــ اسی لمحے چلی گئی۔
ــــ میں ہنس کر بولی ــــ مگر جاتے جاتے اس سے کہہ گئی ہے کہ " تجھے بھی چین سے نہیں رہنے دوں گی "ــــ
میں نے پھر محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر کچھ بے اطمینانی کی جھلک آ گئی ہے ــــ میرے دل میں گرہ سی پڑ گئی ــــ
بچے تھوڑے ہی دنوں میں اس سے بری طرح مانوس ہو گئے وہ بچوں کی آنٹی تھی ــــ "ان" کی بہن تھی ــــ بچے اسے ایک منٹ کے لئے بھی چھوڑنا نہ چاہتے ــــ

کتنی ملنسار ـــ کتنی خوش مزاج اور کتنی پیاری تھی وہ ـــ گو وہ کنواری تھی ـ
اس کے سینے سے ابھی دودھ کی دھاریں نہیں پھوٹی تھیں مگر جب وہ میرے
بچوں کو بھینچ بھینچ کر پیار کرتی تو مجھے محسوس ہوتا کہ اس کا سینہ ماتا سے بھرپور ہے
وہ آئی تو ان کی تنخواہ بڑھی ـــ عہدہ بھی بڑھا ـــ کتنے نیک قدم تھے اس
کے ـــ وہ بڑی خوش تھی ـــ ہم سبھی خوش تھے ـــ کوئی فکر کوئی کڑھن نہ
تھی ـــ ساری پریشانیاں بڑھیا کے دم سے تھیں وہ کیا گئی دنیا گلزار بن گئی
ـــ مگر کبھی کبھی میرے دل میں بڑے بُرے خیالات آتے ـــ اور بڑھیا کا
چہرہ نگاہوں میں گھوم جاتا ـــ پھر مجھے خیال آتا جانے وقت کا کونسا
خوش نصیب لمحہ ہے جو اس پیاری سی لڑکی کا لباس بدل دے گا ـــ پھر
مجھے بڑھیا کے الفاظ یاد آتے جو اس نے جاتے وقت کہے تھے ـــ اس کا سہم
کر رہ جانا یاد آتا ـــ اور میں ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں مانگنے لگ جاتی "معبود
ہماری ہنستی کھیلتی زندگیوں کو یونہی رہنے دے۔ ہم سے ہماری مسکراہٹیں نہ
چھیننا" ـــ!

پھر کچھ دن یونہی گذر گئے ـــ پتہ نہیں کیا ہو رہا تھا پر مجھے ایسا لگتا تھا
کہ ملک میں کچھ ہل چل سی مچ رہی ہے اور میری مسکراہٹوں اور قہقہوں کی رنگینی
کچھ کم ہوتی جا رہی ہے ـــ وہ بھی کچھ بدحواس سی نظر آتی تھی ـــ کچھ پریشان
بھی ـــ سہمی سہمی سی ـــ ایک دن بولی ـــ "وہ بڑھیا بڑی کالی زبان کی تھی"۔

"کیا مطلب ہے تمہارا" ـــ میں گھبرا کر بولی ـــ

"آپ کو یاد ہوگا اس نے کہا تھا کہ مجھے چین سے نہیں رہنے دے گی" ـــ

"ہاں اچھی طرح یاد ہے مگر" ـــ

"وہ تو چلی گئی ـــ لیکن مجھے برباد کرتے ـــ مٹا دینے ـــ اپنی بہن کو بھیج رہی ہے"ـــ

"بہن کو ـــ میں حیرت سے بولی ـــ کونسی بہن"ـــ

جنگ کو ـــ وہ دانت پیس کر بولی ـــ

"جنگ کیا کرے گی آکر"ـــ

"جنگ کیا کرے گی ـــ؟ وہ مٹھیاں بھینچ کر بولی ـــ جنگ کیا کیا کرتی ہے آپ کو نہیں معلوم ـــ بچے یتیم ہو جاتے ہیں ـــ سہاگنیں بیوہ ہو جاتی ہیں ـــ چمکدار کھن کھناتی چوڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں ـــ کوکھ سونی ہو جاتی ہے ـــ باغ اجڑ جاتے ہیں ـــ پھول مرجھا جاتے ہیں ـــ مسکراہٹیں .....

بس کرو ـــ خدا کے لئے چپ رہو ـــ میں نے اپنے بچوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا ـــ میں ایک مرغی کی مانند اپنے بچوں کو اپنے محفوظ کھیے میں لئے بیٹھ گئی ـــ میرے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے ـــ اوہ میرے خدا ـــ یہ میری پیاری زندگی ـــ یہ حسین چمن میرا ـــ میرے ننھے منے غنچے اور پیاری کومل کلیاں ـــ جن کو ابھی پھول بننا تھا ـــ میرا محبت کرنے والا شوہر ـــ میرا چھوٹا سا گھر ـــ میں نے اپنے ہاتھ ساڑی کے پلو سے ڈھانک لئے ـــ

"نہیں یہ چوڑیاں میں کبھی نہیں توڑنے دوں گی ـــ یہ میرے سہاگ کی نشانی ہیں ـــ ان میں میرے شوہر کا دل دھڑکتا ہے ـــ ان میں میرے بچوں کی مسکراہٹیں گنگناتی ہیں ـــ میری چوڑیاں کبھی نہیں ٹوٹیں گی"ـــ

بچے میرے پہلو میں کانپتے رہے ـــ میں سسکتی رہی ـــ کیا واقعی جنگ ہوگی ـــ کیا اس بڑھیا کا کہا پورا ہو جائیگا ـــ کیا میرا گھر ـــ اور میری طرح ہزاروں گھر اجڑ جائیں گے ـــ

اور اس رات مجھے عجیب سا خواب دکھائی دیا ــــ

کتنی حسین شام تھی وہ ــــ میں اپنے گھر کے ننھے منّے سے باغ میں ٹہل رہی تھی ــــ میرے بچّے اپنے کھیل میں مصروف تھے ــــ آسمان پر اودی اودی بدلیاں چھائی ہوئی تھیں ــــ اور بڑی مدھ بھری ہوائیں چل رہی تھیں ــــ مجھے ایسا لگا سر پر سے کوئی چیز گزر رہی ہے ــــ میں نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا میرا خیال غلط نہ نکلا ــــ وہ پیاری سی لڑکی ہواؤں میں بھی چلی جا رہی تھی ــــ اس نے اپنا پرانا لباس بدل دیا تھا ــــ اس کے حسین جسم پر سفید ریشم کا چمکدار لبادہ تھا جس پر بڑے بڑے نیلے پھول بنے ہوئے تھے ــــ اور دونوں کندھوں پر دو فاختائیں بیٹھی ہوئی تھیں ــــ اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا ــــ سنہرے بالوں کے چھلّے گالوں پر آ گرے تھے، وہ بڑے پیارے انداز سے مسکرا رہی تھی ــــ

"تم کتنی حسین نظر آ رہی ہو" ــــ میں اس کے حسن سے مرعوب ہو کر بولی ــــ وہ ہنس پڑی ــــ "دیکھو میں نے اپنا لباس بدل لیا ہے ــــ دیکھو یہ نیا لباس ــــ یہ امن کا لباس ہے ــــ اب جنگ کبھی نہیں ہوگی ــــ" ــــ میں خوشی سے چلّا پڑی ــــ کیا واقعی جنگ نہیں ہوگی ــــ اب تو میرا گھر نہیں اجڑے گا ــــ اب تو کوئی میری چوڑیاں نہیں توڑے گا" ــــ

"ہاں اب کبھی جنگ نہیں ہوگی ــــ آؤ تم بھی یہ لباس پہن لو ــــ اس نے میری طرف ہاتھ بڑھائے ــــ اور دوسرے لمحے میں نے دیکھا کہ میرے جسم پر بھی ویسا ہی لباس ہے ــــ میرے بھی کاندھوں پر دو پیارے پرندے بیٹھے تھے ــــ وہ کان میں جھک کر بولی ــــ یہ امن کی پیامبر ہیں. ــــ ننھی منّی فاختائیں" ــــ

" میرا دل پہلو سے نکلا جا رہا تھا ـــ مارے خوشی کے میں بے سدھ ہوئی جا رہی تھی کہ اب جنگ نہیں ہوگی ـــ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا ـــ
آؤ ہم امن کا گیت گائیں ـــ خوشی کا گیت گائیں ـــ ہم دونوں ہوا میں بہہ رہے تھے ـــ ہمارے لباس سرسرا رہے تھے اور ہم گا رہے تھے ـــ" امن کا گیت خوشی کا گیت۔

اور پھر مجھے ایسا لگا گویا میں تیزی سے نیچے کی طرف آ رہی ہوں ـــ
گیت کے بول چیخوں میں ڈھل گئے ـــ کوئی میرا لباس چھینے لے رہا تھا ـــ میں دونوں ہاتھوں سے ان ہاتھوں کو ہٹا رہی تھی مگر مجھے ایسا لگا کہ ان ہاتھوں کے مقابلے میں، میں بہت ہی کمزور ہوں ـــ وہ لڑکی مجھ سے چھوٹ گئی ـــ میں نے گھبرا کر چیخ ماری اور پھر میری آنکھ کھل گئی ـــ میں اپنے پلنگ پر پڑی کانپ رہی تھی ـــ چیخ سن کر وہ دوڑی آئی ـــ

"کیا ہوا" ـــ اس نے بہت ہی نرم لہجے میں پوچھا ـــ
" کچھ نہیں ـــ میں سہم کر بولی ـــ میری آنکھیں بھیگی بھیگی سی تھیں ـــ میں اس سے لپٹ پڑی ـــ تم مجھے چھوڑ کر چلی تو نہ جاؤ گی" ـــ
میں سسک پڑی ـــ میں نے اسے اپنا خواب سنایا ـــ
اس کے چہرے پر بھیانک سیاہی پھیل گئی ـــ

زندگی وہی تھی ـــ مگر ایسا لگتا تھا کہ کوئی شے گم ہوتی جا رہی ہے ـــ ایک عجیب سی ویرانی چھانے لگی ـــ وہ بھی پریشان سے تھے ـــ میرا تو پوچھنا ہی کیا ـــ مگر وہ لڑکی اداس اداس سی تھی ـــ اس دن بچے اپنے کھیل میں مصروف تھے۔

— ماضی مستقبل سے بے پرواہ — یہ ننھے پودے کتنی تیزی سے — کتنی بے فکری سے بڑھ رہے تھے — وہ کھیل رہے تھے مسکرا رہے تھے — بچے — آنٹی — آنٹی — کہہ کر اس کے آزو بازو گھوم رہے تھے — مگر آج اتنے دنوں میں پہلی بار میں نے دیکھا کہ "آنٹی" رو رہی تھی — اس کی حسین آنکھوں میں آنسو تھے — جبکہ وہ یہ کہتی تھی کہ میں بڑی مصیبت آنے پر بھی نہیں روتی — میں کانپتے ہاتھوں میں ننھی کو سنبھالے ہوئی تھی — ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھا —

"تم تو کہتی تھیں کہ تم کبھی نہیں روتیں — پھر آج کیا ہو گیا" —

اس نے کچھ جواب نہ دیا — جاوید کی چھوٹی سی کتاب اٹھا کر میری آنکھوں کے سامنے کر دی — بچکانہ تحریر میں سرورق پر لکھا ہوا تھا۔

"یہ جاوید ارشد کی کتاب ہے اس کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا" —

پھر اس نے ایک ڈبہ اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا — طرح طرح کے کھلونوں سے بھرا ہوا ڈبہ — جس کے ڈھکنے پر لکھا ہوا تھا —

"ہمارے اچھے کھلونوں کو کوئی بھی نہیں توڑ سکتا" —

پھر اس نے ایک ڈرائنگ کاپی دکھائی — گلاب کا ایک ٹیڑھا میڑھا پھول بنا ہوا تھا — سرخ پینسل سے کی گئی تھی — اس کے نیچے لکھا تھا:

میرے پھول کوئی نہ توڑے — شکریہ — اسلم ارشد" —

وہ سسک پڑی — مگر بہن — ان ننھی منی کتابوں کی طرف — ان رنگین کھلونوں کی طرف — ان پیارے پیارے پھولوں کی طرف کسی کے ہاتھ — خوفناک ہاتھ بڑھ رہے ہیں — یہ کتابیں — یہ کھلونے —

یہ پھول ـــ یہ گیندیں ـــ یہ بلّے ـــ آہ میرے پیارے بچّے ـــ مامتا کے بوجھ کے اس کی چھاتی پھٹ گئی ـــ وہ سسک رہی تھی اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے ـــ

میں کانپ اٹھی ـــ میرے خدا ـــ میں کیا کروں ـــ ہائے میرے ان ننھے منّے ہاتھوں کی یہ معصوم تحریریں ـــ یہ میرے شاداب غنچے ـــ

"آنٹی" روتی کیوں ہیں ـــ اسلم نے اپنا ننھا سا ہاتھ بڑھا کر آنٹی کے آنسو پونچھ دیئے ـــ مگر آنکھیں بھر آئیں ـــ

میں نے دل پکا کر کے کہا ـــ "تم نہ روؤ بہن ـــ تم روتی ہوئی اچھی نہیں لگ رہی ہو" ـــ اور میں نے اپنے پلّو سے اس کی آنکھیں پونچھ دیں ـــ

"اگر میں تمھیں روتی ہوئی اچھی نہیں لگ رہی ہوں تو پھر مجھے ہنسا دو" ـــ

"میں" ـــ میں حیران ہو کر بولی ـــ "میں تم کو ہنسا سکتی ہوں" ـــ!!

"ہاں تم مجھے ہنسا سکتی ہو" ـــ

"وہ کیسے"

"تم کہانیاں لکھتی ہو نا ـــ تمھاری تحریر کئی گھروں میں جاتی ہے ـــ تمھاری آواز بڑی دُور دُور جا سکتی ہے ـــ جاؤ میری کہانی لکھ دو ـــ سب کو سنا دو کہ "آزادی" کبھی نہیں روتی تھی مگر اب رو رہی ہے کہ جنگ ہونے والی ہے ـــ مجھے امید ہے تمھاری آواز سُن کر سبھی لوگ تمھاری حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں گے ـــ ہزاروں ہاتھ ـــ بوڑھوں کے سوکھے ہاتھ ـــ جوانوں کے مضبوط اور صحت مند ہاتھ ـــ ننھے بچّوں کے معصوم ہاتھ ـــ کومل ہاتھ ـــ یہ سب ہاتھ امن کی اپیل پر دستخط کریں گے ـــ اور پھر

یہی ہاتھ امن کا پرچم تھام لیں گے ـــــ ہاتھوں میں بڑی قوت ہے ـــــ اور قلم میں اس سے بھی زیادہ قوت ہے ـــــ

میں مبہوت ہو کر بولی ـــــ "تو تم آزادی ہو" ـــــ

"ہاں میں آزادی ہوں ـــــ اور وہ بڑھیا غلامی تھی جو اپنی بہن جنگ کو مجھے برباد کرنے کے لئے بھیج رہی ہے ـــــ مگر مجھے جنگ سے خوف نہیں ـــــ مجھے اُمید ہے جنگ کبھی نہیں ہوگی کہ تم جیسے اہلِ قلم میرا ساتھ دیں گے ـــــ تمہارا قلم میرا ہے ـــــ تمہاری آواز میری اپنی آواز ہے ـــــ تمہاری پکار میری اپنی پکار ہے۔ اور مجھے اپنے قلم پر ـــــ اپنی آواز پر ـــــ اپنی پکار پر پورا پورا بھروسہ ہے۔"

میں آزادی کو دیکھتی رہی ـــــ اس کی پُر یقین باتیں سنتی رہی پھر میں نے قلم اٹھا کر اُس کی کہانی لکھنی شروع کر دی ـــــ

چھوٹے بڑے

میں حیدرآباد سے بی۔ اے کا امتحان دے کر اپنے گاؤں شادنگر لوٹ رہی تھی۔ ــــ میں نے سارے مسافروں کو گاؤں سے باہر ہی چھوڑ دیا تھا۔ پتاجی نے میرے لئے سواری کو گھوڑا اور دو نوکر بھجوا دیئے تھے (آخر زمیندار جی کی بیٹی تھی نا؟) سفر کی تھکن سے میرا چہرہ مضمحل ہو رہا تھا، میرا کندن جیسا رنگ دھوپ کی تپش سہتے سہتے سُرخ پڑ گیا تھا۔ اپنے سنہرے بالوں کو میں نے ایک ہرے رنگ کے رومال سے باندھ کر رومال کی گرہ ٹھوڑی کے نیچے دے رکھی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے میرے بال، رومال کی گرفت سے نکل نکل پڑتے، رکاب میں میرے پاؤں ڈولنے لگتے ــــ میں ہر لمحہ یہ سوچ رہی تھی کہ کب گھر تک پہنچتی ہوں ــــ

جیسے ہم کچی پگڈنڈی سے ہٹ کر کھیتوں کی طرف والی پگڈنڈی کی طرف مڑنے لگے تو میری آنکھیں کچھ نامانوس سے منظر پر جم گئیں ــــ

"ارے یہ کھیت؟ اور اس کھیت میں یہ کام کرنے والے ......؟"

کلّو میرا بڈھا ملازم میری نظروں سے میرا مطلب بھانپ گیا۔ مسکرا کر، کچھ طنز سے بولا ... ــ

"مالکن یہ شمبھو ناتھ جی کے بڑے بیٹے کا کھیت ہے۔ وہی جو حیدرآباد سے زراعتی کالج میں پڑھ کر آیا ہے اور ہر گھڑی گاؤں والوں سے کہتا پھرتا ہے کہ نئے طریقے سے کھیتی باڑی کرو ـــ حکومت کا ساتھ دو ـــ اپنے خیالات بدلو....." اور کلو زور سے ہنس پڑا۔

"شمبھو ناتھ جی کا بیٹا ـــ یعنی سورج ـــ" میں کھیت کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

"جی ہاں جی ہاں، وہی سورج ـــ اب دیکھیں کون بڑا سورج بن کر گاؤں کو جگمگاتے ہیں، مہاراج ـــ"

کلو کے مہاراج کہنے میں بڑا تیکھا طنز موجود تھا، کیونکہ شمبھو ناتھ جی بیچارے ہماری طرح اونچی ذات کے برہمن نہ تھے، بلکہ ہریجن تھے جن کی آج کے سماج میں کوئی عزت ہو تو ہو ہمارے گاؤں میں بالکل پوچھ نہیں ـــ جی ہاں میں اپنے عیب چھپانے والوں میں سے نہیں ہوں، میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ ہمارے اس چھوٹے سے گاؤں شادنگر میں (جس کا پتہ نہیں کتنوں کے دل رنجیدہ بھی کئے ہوں گے، مگر کہلاتا شادنگر ہی ہے) طرح طرح کے لوگ آباد ہیں، چھوٹے بڑے بھی، مگر آج تک یہ نہ ہوا کہ بڑوں نے چھوٹوں کا دل رکھنے کی خاطر انھیں بھی اپنی طرح انسان سمجھا ہو ـــ!!

مجھے اچھی طرح یاد ہے شمبھو ناتھ جی کے ماں ایک بار بہت برے دن آئے تھے۔ گاؤں کا یہ دستور تو ہمیشہ سے ہے کہ جیت زمیندار کی ہوتی ہے اور بے چارے چھوٹے کاشتکار ہمیشہ زمیندار کے مظالم سے اس طرح پس جاتے ہیں جیسے چکی کے دو پاٹوں کے درمیان گیہوں ـــ اس بار بھی ایسا ہی ہوا، شمبھو ناتھ میرے اپنے پتا کے قول دار تھے (یعنی پتا جی کی چکی میں پسنے والا گیہوں کا بے بس دانہ!!) پتا جی کی زمین پر کاشت کرتے تھے اور فطری طور پر ان سے دبتے تھے۔ اس سال

فصلیں ابھی تباہ ہوئیں کہ کسانوں کی جان پر بن گئی۔ حد یہ کہ وہ سال بھر کے لئے جو اناج گھروں میں سینت کر رکھ لیا کرتے تھے، وہ تک نہ رکھ سکے ـــــ ایسے ہی بُرے دنوں میں ایک ایسا دن بھی آیا کہ اسی اناج نے ان کی ننھی لڑکی کو ان سے چھین لیا ـــــ میری آنکھوں دیکھی بات نہیں ہے کیونکہ میں تو اپنی تعلیم کی خاطر شہر گئی ہوئی تھی۔ ہاں چھٹیوں میں گھر آنے پر مجھے پتہ چلا تھا کہ شمبھو ناتھ جی کے ہاں فاقوں کی نوبت آگئی تھی۔ نیچی ذات کے لوگوں میں بھی کئی لوگ غیور طبع ہوتے ہیں، ان کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلائیں ـــــ آس پڑوس کے لوگوں نے پتا جی سے آکر کہا ضرور مگر پتا جی بھی آخر زمیندار تھے، کسی کی اونچی ناک کیسے دیکھتے۔ پتا جی کا کہنا بس یہ تھا کہ شمبھو ناتھ خود آکر ماٹھا ٹیکیں اور اپنے منہ سے مانگیں اپنی جھولی ان کے آگے پھیلائیں ـــــ نہ پتا جی نے اپنی بات جانے دی نہ شمبھو ناتھ نے ـــــ ہاں اس اونچی ناک کے جھگڑے میں ننھی لتا نے ضرور دم توڑ دیا ـــــ کہتے ہیں جس دن لتا نے دم توڑا اسی دن سورج نے ہاتھ میں مٹی اٹھا کر سوگند کھائی کہ ـــــ "میں دھرتی ماتا کی سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ جس گیہوں کے دانے کے لئے میری بہن نے تڑپ تڑپ کر دم توڑا ہے، جب تک اس کے ڈھیر اپنے آنگن میں نہ لگا لوں چین سے سانس تک نہ لوں گا ـــــ" تب تک سورج کا یہ حال تھا کہ شاد نگر کے دوسرے کسانوں کے لڑکے بالوں کے ساتھ مل جل کر دن بھر غلہ لیں بنایا کرتا اور دوسرے کے کھیتوں سے چرا چرا کر موسم کے پھل کھایا کرتا۔ لیکن جس دن سے اس نے یہ فیصلہ کیا بالکل بدل کر رہ گیا۔ اس وقت بھی اس کی عمر کچھ کم نہ تھی، اپنے پتا کے پاس پڑھنا لکھنا تو سیکھ ہی چکا تھا لیکن اس فیصلہ کے بعد اس نے باقاعدہ شہر جا کر پڑھنے کی رٹ لگا دی۔ شمبھو ناتھ جی کی پتنی کے

جو زیور پتاجی کے پاس رہن تھے وہ اس نے ضد کر کے سب بکوا ڈالے اور شہر چل دیا۔

دن ہوا کے دوش پر سوار ہو کر گذرتے گئے اور دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے گئے اور ایک دن وہ بھی آیا کہ جب سورج شہر سے پلٹا تو ایک خوبرو جوان بن چکا تھا اور انگریزی میں باتیں کرتا تھا، وہ اپنے ساتھ زراعت کے نئے نئے طریقے لایا تھا "مگر رہا پھر بھی ہریجن کا ہریجن ہی" (یہ میرے پتاجی نے فرمایا تھا!!)

گاؤں واپس آکر اس نے سب سے پہلے اپنے پتا کو زمیندار کے دباؤ سے آزاد کیا اور فیصلہ کیا کہ اب اپنا ذاتی کھیت اور ذاتی کاشت ہو گی۔ بھوناتھ جی بیٹے کو دیکھ کر اور اس کے ارادوں کے بارے میں جان کر خوش تو ضرور ہوئے مگر اصل سوال روپے کا تھا۔ الگ سے کھیتی باڑی کرنے بیٹھتے تو روپیہ کہاں سے لاتے۔ اس مشکل کو خود سورج نے یوں حل کیا کہ شہر جا کر اپنے بھروسے کے دوست سے روپیہ ادھار لیا اور اپنے ارادوں کی تکمیل میں جٹ گیا!

دن بدلتے کیا دیر لگتی ہے؟ کل تک جہاں خاک اڑتی تھی اب لہلہاتے ہوئے کھیت اور ڈھیروں اناج تھا۔ زندگی خوش و خرم اور ہنستے گاتے بسر ہوتی تھی۔ سورج گاؤں والوں کے لئے ہیرو بن گیا۔ اس کی خوش مزاجی، اس کا نرم لب و لہجہ، اس کا کھیتی باڑی کرنے کا جدید طریقہ ــــ اس نے گویا سب کا دل موہ لیا، مگر پتاجی جہاں کے تہاں رہے بلکہ سورج کی شہرت اور مقبولیت دیکھ کر پہلے سے کچھ زیادہ ہی اونچی ذات اور نیچی ذات کے قائل ہو گئے ــــ وہ اپنی جلن مٹانے کے لئے کہا کرتے ــــ "ارے یہ چھوٹے لوگ کم بخت ــــ ان کے باپ نے بھی کبھی زمینداری کی ہو گی؟" مگر خود سورج اپنے آپ کو زمیندار کہلوانا پسند بھی کب کرتا تھا؟ وہ تو مجھ کو بھی ہر ایک سے بڑی خوش مزاجی سے پیش کرتا۔ "میں تو آپ کا خادم

ہوں ـــ آپ کا سیوک ہوں ....."

چلتے چلتے ایک گڑھا آیا اور میں اپنا وزن برقرار نہ رکھ سکی۔ رکاب میں سے میرے پاؤں نکل پڑے اور کلو اور رام داس ابھی "ہے بھگوان" کہتے ہوئے لپک ہی رہے تھے کہ سامنے کے کھیت سے ایک نوجوان بھاگتا ہوا آیا اور مجھے اپنے ہاتھوں پر اٹھالیا۔

"چندا دیوی ـــ آپ زمیندار جی......"

ابھی بات اس کے منہ میں ہی تھی کہ دونوں نوکر تیزی سے آگے بڑھے اور بدتمیزی سے بولے۔ "پتہ ہے زمیندار جی کی بٹیا ہیں" (بے چارے پتا جی کا نمک بھی تو کھاتے تھے نا!) سورج کے چہرے کا رنگ اڑ گیا ـــ وہ منہ سے کچھ بھی نہ بول سکا ایسی آنکھوں سے مجھے دیکھا کر میرا انگ انگ تھرا گیا ـــ رکاب میں ایک سینڈل ابھی تک الجھی ہوئی تھی۔ ایک گڑھے میں گر پڑی تھی۔ وہ تیزی سے گڑھے میں اترا اور سینڈل میرے پیروں کے قریب رکھ کر بڑی دھیمی اور غمگین آواز سے بولا۔

" انسانیت سے مجبور ہو کر میں نے آپ کو گرنے سے بچا تو لیا، مگر بالکل بھول گیا تھا کہ آپ بڑے لوگ ہیں اور ہم چھوٹے......"

اور جس تیزی سے وہ آیا تھا اسی تیزی سے چلا بھی گیا۔

میں نے اُسے دُور تک جاتے ہوئے دیکھا اور پھر اچک کر گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ چلتے چلتے ہم تینوں اس کے کھیت کے پاس پہنچے تو وہ سر جھکائے ہوئے ایک مینڈھ کے پاس ہماری طرف پیٹھ کئے کھڑا تھا۔ میں نے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے کہا۔

ابھی ابھی تم نے کہا تھا آپ بڑے لوگ ہیں، ہم چھوٹے۔ لیکن اس چھوٹائی بڑائی کی خلیج کو ہم کبھی پاٹ بھی سکیں گے یا نہیں ؟"

اس نے بڑی طرح چونک کر پلٹ کر دیکھا اور حیرت زدہ لہجے میں بولا ــــ چندا...... بڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر میں گھوڑے سے کود پڑی ــــ بڑی مشکل سے وہ بول سکا ــــ "شاید کبھی نہیں"۔ جیسے اپنے آنسو پیتے ہوئے اس نے کہا۔ " یہ گاؤں جس کا نام شاد نگر ہے، حقیقت میں شاد کرنے والا نہیں۔ اس نے تو سدا ہم چھوٹوں کو آنسو ہی دیئے ہیں۔ ہم یہ خلیج کبھی نہ پاٹ سکیں گے ۔"

میں پورے وشواس کے ساتھ بڑھی اور مسکرا کر بولی ــــ "لیکن سورج تم نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ میرا نام چندا ہے اور چاند اپنی روشنی سدا سورج سے مستعار لیتا ہے ۔"

اس نے چونک کر مسرت سے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے جگنو چمکنے لگے۔ میں نے شرما کر اس کی طرف دیکھا اور دوسرے لمحے میں زمین پر پڑی ہوئی کدال اٹھا کر سوندھی سوندھی دھرتی کا سینہ چیرنے لگی !! ۔

اژدھا

پیں ۔ پیں ۔ پیں
اور ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ جیپ گاڑی گاؤں میں آکر رک گئی ۔

نائب تحصیلدار صاحب نے اپنا خاکی ہیٹ سر پر اچھی طرح جمایا ۔ اور چھلانگ مار کر جیپ سے اتر پڑے ۔

ان کے پیچھے اہلکار اور اردلی بڑے ادب کے ساتھ مگر مستعدی سے اترے اور دور سے ایک ایک کر کے آتے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگے ۔ گاؤں کے پٹیل، پٹواری، بڑے چھوٹے جمعدار آگے آگے اور پیچھے پیچھے ایک خلقت امڈی چلی آرہی تھی ۔

نندکمار نائب تحصیلدار نے اپنے طور پر دو چار خاکی ڈریس سلوا رکھے تھے کہ گاؤں کے لوگوں پر خاکی وردی کا اثر ہی کچھ اور پڑتا ہے قریب آتے ہی پٹیل نے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کی ۔ ہیں ہیں کر کے مزاج پوچھا ۔ نائب تحصیلدار کا یہ پہلا دورہ تھا ۔ــــ سوچا آج کھل کر بات کی تو "سمجھو پہلے ہی ہلے میں رعب ختم ــــ ! گردن کو ذرا نہوڑا کر بولے ۔

"ٹھیک ہے ۔ ٹھیک ہے ۔"

بڑے صاحب کے رہنے کا بندوبست کرنے سے ادھر ہٹ کر کر دیئے ہیں ہم لوگ ہزور۔" پٹیل بے حد لجاجت سے بولے۔
اہلکار "بڑے صاب" کا خطاب اپنے چھوٹے صاحب کے لئے پاکر پھولوں نہ سمائے۔ ذرا ڈپٹ کر، جس میں شہری شان تھی، بولے
"تم لوگ گھاس کھا گئے ہو کیا۔"
"بڑے صاحب اپنی چھولداری اور سامان ساتھ لائے ہیں — تم لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ بڑے صاحب دوسرے صاحبوں کی طرح "کھانے پینے" والے صاحب نہیں ہیں، تم یہ مت سمجھو کہ وہ ڈالیاں وصول کرتے پھریں گے۔"
پٹیل پٹواری سہم سے گئے۔ پھر بھی ہمت کر کے پٹیل بولے —
"وہ تو صاحب یہ دیر ہا شہے پر یہ تو ہونے سے رہا کہ ہم لوگ صاحب کے کھانے پینے کا خیال نہیں کریں گے — ہم کو تو بڑے سبیرے سے معلوم پڑ گیا تھا کہ بڑے صاحب آرہے ہیں — ہم تو ...."
"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" —
بڑے صاحب نے سوچا بڑپن میں مارے نہ جائیں۔ "اب ہمیں گاؤں والوں کا اتنا خیال تو کرنا ہی پڑے گا —" انھوں نے اہلکار کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔
سبھوں کی جان میں جان آگئی —"تو سرکار آپ، کتنے دن رکیں گے کر کے —"
پٹواری بولا —

ایک زمیندار نے پٹواری کو گھور کے دیکھا "ایڑا (پاگل) کہیں کا.
ارے ابھی دم بھی نہیں لئے سرکار اور جانے کا سوال ٹرے مارا ـ"
"ابھی تو ہم ہیں بھئی ـ جلدی کا ہے کی ہے ـ" نائب تحصیلدار نے مسکرا
کر جواب دیا اور یہاں سے وہاں تک ساروں کے چہرے کھل گئے ـ
بڑا صاحب مسکرا بھی سکتے ہیں ـ !!
"مہربانی ہے صاحب آپ کی ـ"
ایک دوسرے زمیندار ہاتھ جوڑ کر بولے ـ
"اب آپ آئے ہیں تو ہمارے بہت سے ادھورے کام پورے
ہو جائیں گے ـ"

صاحب نے ذرا حیرت سے دیکھا
" ادھورے کام ؟ کیسے کام ـ کیا بجلی نہیں پہنچی تمہارے
گاؤں میں اب تک ـ"
"نہیں صاحب ـ بجلی تو سمجھو آپ آدھے سے زیادہ مہاراشٹر
میں پہنچ چکی ہے ـ پر اور بھی تو کام ہیں ناصاب ـ ؟"
" ارے ابھی تو سرکار تھکے ماندے آئے ہیں ـ ابھی کائے کو اتّا
بوجھ ڈال رئے رے ـ کیا سیرا نہیں ہو گا کیا کل ـ"
اہلکار، اردلی اور گاؤں کے کچھ لوگ، مل کر کھٹا کھٹ خیمہ نصب
کرنے میں لگے ہوئے تھے ـ گاؤں کے بچے، لڑکیاں، کچھ عورتیں
بھی تماشہ دیکھنے کی خاطر کھڑے ہوئے تھے ـ
" تو حضور اب اجازت دیتے ـ ؟

آپ کے کھانے پینے کا بندوبست کریں گے۔"

حضور مسکرا دیئے —

"صاحب آپ مٹن، مچھی، مرگی تو کھا لیتے نا —؟"

"اب بھئی جو بھی آپ لوگ کھلا دیں — کھانے پینے میں انکار کیسا۔ اور بھگوان نے ہر چیز پیدا ہی کی ہے کہ اسے کھایا جائے۔"

میٹرک پاس دتو زیرلب بولا — "اور اس میں انسان بھی شامل ہے۔"

لیکن اس کی بات کسی نے نہیں سنی۔

اب آپس میں تو تو میں میں ہونے لگی کہ بڑے صاحب کا کھانا کس کے گھر سے جائے۔ ہر بڑا آدمی اپنے طور پہ یہ خدمت اپنے ذمہ لینا چاہ رہا تھا۔ قرعہ فال پٹیل کے حق میں پڑا۔

" حضور اس جگہ تو بجلی کا گولہ نہیں لگ سکے گا، میں گھر سے دو پیٹرومیکس بھجوا دیتا ہوں۔" وہ جاتے جاتے جتا گئے۔

واپسی میں پٹیل بھندو کی جھونپڑی پر رُکے۔

"ارے بھندو تو نے مرغیاں پالا تھا نا۔"

" ہو سرکار —"

"کتنی ہوئیں گی ؟"

"ٹھہرو سرکار گھر والی کو پوچھتا ہوں۔"

"لالی — لالی۔" اس نے پیچھے مڑ کر آواز دی

لالی شاید کبھی لالی رہی ہو اس وقت تو بالکل کالی تھی۔ لپکی ہوئی آئی۔

سامنے پٹیل کو دیکھ کر دنگ رہ گئی پھر اک دم شرم یاد آئی۔ لالی بن کر بولی ۔

" کا ئے کی ہٹری (جلدی) ہے رے"

"ارے اپنے پاس مرغیاں ہیں نا ۔ ؟"

"آدھے تو ہاٹ میں بیچ دیئے نا ۔"

"پٹیل سرکار کو ہونا ۔ کتے ہیں ۔"

" اگو بائی (اظہار حیرت) ۔ " وہ گھبرا کر بولی ۔ پھر چپ ہو گئی جانتی تھی کہ پٹیل مرغیاں مانگے گا تو دام دام نہیں ملنے والے ۔

" اری ایڑی بولتی کا ئے کو نئیں ۔ کتنے ہیں ۔" پھند چڑھ کر بولا ۔

" کھڑاڑے میں جا کے دیکھتا کیوں نہیں ۔" وہ ایک تنک کے سے بولی اور جھونپڑی میں داخل ہو گئی ۔

" سرکار پانچ ہیں ۔ " وہ گن کر بولا

" پھٹوریاں ہیں کہ کڑک ہیں ۔"

پٹیل پوری ریسرچ کرنے پر تلے ہوئے تھے کیوں کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ کمسن مرغیاں ہوں جو جلدی گل جائیں اور لذیذ پکیں سخت اور معمر مرغے اور مرغیاں لذت کھو دیتی ہیں ۔

" پھٹوریاں ای ہیں سرکار ۔ کڑکے تو ہاٹ میں نیئں بیچے ۔ ایک بھانف (بھانپ) میں گل جائیں گے سرکار ۔"

وہ اب سمجھ چکا تھا کہ یہ شہر سے آنے والے نئے بابو صاحب

کا کھانا پکنے کی تیاری ہو رہی ہے۔

پٹیل بے نیازی سے جاتے جاتے بولے "چار پھوری
حہاڑی (حویلی) پر بھجوا دے۔"

"بہت اچھا سرکار۔"

لالی خوب غصّہ سے باہر نکلی۔

"وہ ماکڑ (بندر) کا بچّہ — اب ہم اچھوت نئیں کیا۔
ہماری مرگیاں کھائیں گا۔"

"اری ایڑی — وہ تھوڑی کھانے والا — وہ تو وہ بڑا
صاب آیا ہے نا اس کو کھلائیں گا۔"

"ہو ہو تو پکائیں گا تو اپنے باسن میں نا"!

"لالی اب چُپ سونگ (تماشہ) مت کر۔ معلوم ہے
جو حکم مل گیا سو نبھانا پڑتا۔"

"تیرے ایسے چالوں سے تو تو نقصان (نقصان) اُٹھاتا۔
تیرے سامنے سے تو کوئی ایک دن بھاکری (روٹی) بھی اُٹھا کے
لے جائیں گا، ہاں بول دی میں —"

"سو کبھی بھاکری کون لے جانے لگا — کون سے پراٹھے
کھا رئے کر کے ہم — ہونہہ" اور وہ ڈربے میں ہاتھ ڈال کر
ٹٹول ٹٹول کر چھوٹی چھوٹی مرغیاں نکالنے لگا جو ابھی انڈوں پر
نہیں آئی تھیں —

رات ہوتے ہوتے گاؤں میں بڑی چہل پہل ہوگئی بس میلے کا سا سماں ہوگیا ۔ گاؤں میں بجلی آئی ضرور تھی لیکن غربت کے بارے لوگ زیادہ روشنی دینے والے بلب جلاتے نہیں تھے کہ بل زیادہ آئے گا ۔ مٹیالے بلبوں کی روشنی کے مقابل جگر مگر کرتے پٹرومیکس جب گاؤں کے پرلے کنارے روشنی بکھیرنے لگے تو پتنگے اور گاؤں والے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے ۔

آشا اپنی جھونپڑی میں روتی پڑی تھی ۔ اس کی سہیلیوں نے بیحد منایا لیکن وہ یوں ہی اوندھی پڑی سسکتی رہی ۔" چل ناگڑی (سکھی) ۔ مزہ کریں گے ....."

" اری دلدر ۔ کائے کو روئے رئی ۔" لالی نے دس بار پوچھا مگر وہ یونہی روئے گی ۔

" جا جی اس کو بولنا ہمارے سنگ پلے (کھیت) تک چل کرکے ۔"

" ملے سے اتی رات کو بھاجی تو ڑیں گیاں تو بھوت چڑیل ہلگ (لپٹ) جائیں گے ۔"

" اوو جاجی ۔ ایڑی کیئیں کی ۔ ہم تو گمت (کھیل) دیکھنے جارتے ۔ وہ سہر سے بڑا صائب آیا نا ۔ کرکے ۔"

" ہونہہ گمت ۔" لالی چڑ کر بولی ۔" کوئی تم میں سے پسند آگئی تو گمت تو جائیں گی چولے بھاڑ میں ۔ وہیں ٹلپٹ (سلانا) کردیں گا ۔"

مکتی ڈر کر بولی ۔۔ "ایسا نکّو بول چاچی ۔۔ تیرے جو منہ میں آتا اگر ملم بگرام بک دیتی تو۔"

" جو ہانڈی میں رہتا دوئی ڈوئی میں آتا ۔۔ ہم کو معلوم ہے۔ دوئی ہم بولتے۔" وہ اچانک اپنی بیٹی پر برس (...) ۔

" اس کو دیکھو نیستی کو ۔ کتنا پکارر ۔۔ ۔۔ مانے کو اُٹھتی نہ کام کو ۔ جاؤ تم رانڈاں بھی جاؤ ۔"

آشا تلملا کر اُٹھی ۔

" نیستی بولی میرے کو ۔ نیستی ہوتی تو اِتّے کام کرتی ۔ ؟ کائے کو بابو میرے کو پٹیل کے ہاں بھوریاں لے کے بھیجا ۔ وہ موا بڈھا پٹیل میری کمر کے کمر دوڑے (کمر پٹہ دھاگے کا) کو انگلی لگا کے بولا ۔ کتی گوری چاندی کے ویسی کمر ہے ۔ میں روؤں نئیں کیا ؟ یہ ہنسنے کی بات ہے کیا ۔"

لڑکیاں سُن ہو گئیں ۔ لالی چولہے میں ، پھکنی اُٹھا کر پھونکیں مارنے لگی ۔ گودڑی میں لیٹا پھندو غصّہ سے بولا ۔

" سب ایک سری (ایک جیسے) کے ہیں ۔ اُن کی ماں کے ۔ دیکھنا سب کے ماداں بہنا بیٹیاں کو جور اُٹھا کے لے جائیں گے اور کھلے ہیں ۔۔۔ ہو دیکھنا یہی ہوئیں گا ۔"

لالی جل کر بولی ۔ " میری تو جندگی گجر گئی ، میں تو آج تک نئیں دیکھی کہ یہ بڑے لوگوں کے عورتاں کو کوئی اُٹھا کے لے گیا ۔۔ "

میاں بیوی کو آپس میں جھک جھک کرتا دیکھ کر ساری لڑکیاں

بجلی جانی / ۱۹۸۲ ... (handwritten margin note, partly illegible)

اب "بڑے صاحب" گیس کی جھل جھل روشنی میں اپنے خیمے سے باہر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھا رہے تھے۔ پٹیل کے ہاں سے گدّوں والی آرام کرسی آگئی تھی۔ وہ اس پر آدھے لیٹے آدھے بیٹھے تھے۔ نیچے بوڑھوں، متحصیلوں اور حاجیوں پر گاؤں کے لوگ بیٹھے حیرت سے سر ہلا ہلا کر اُن کی باتیں سُن رہے تھے۔ قاعدے کے مطابق صاحبِ حیثیت لوگ سامنے بیٹھے تھے اور پیچھے غریب غربا۔

چمکتی جھماتی چیزوں کا اچانک ایک غول آیا اور نائب تحصیلدار کو آرام کرسی پر اپنی نشست کا انداز بدل دینا پڑا۔ اس طرح آدھے بیٹھے آدھے لیٹے تو وہ ان کا اچھی طرح دیدار کر ہی نہیں سکتے تھے۔ گردن کے پیچھے ایک ملایم تکیہ رکھ کر ذرا وہ اونچے ہوتے اور مسکرا کر بولے۔

"آپ کے ہاں لڑکیاں جلدی سوتی نہیں ہیں شاید۔"

ان کی بات کوئی لطیفہ نہیں تھی لیکن پھر بھی سارے لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

دِتو اپنے آپ میں جل کر کچھ زور سے بولا۔ "سالے چچے کہیں کے۔ بلکہ کفگیر۔"

بھیکو اس کو ٹھیل کر بولا۔ "ہو بے سالے چار اکشر پڑھ کر تو ایک ایک کی ٹانگ کیوں گھسیٹنے لگا ہے۔ ایسا ہی ہے تو تو چار لوگوں میں آکر بیٹھتا ہی کیوں ہے؟ اپنے جھونپڑے میں بیٹھنا جا کر۔"

"بھیکو بھائی۔ چار لوگوں میں اس لیے اٹھتا بیٹھتا ہوں کہ دنیا

کا رنگ ڈھنگ سمجھنے کو سکوں ۔"

"اور جیسے تم بابو جگ جیون رام ای تو بن جائیں گے نا ؟"

"سبھی بوجھو تو اپنے واسطے تو اپنے بابو جی نے سبھی کچھ نہیں کیا۔

اپن سمجھتے ستے بڑے دھنتر (کارگزار معتبر) ہیں بابو جی ـــــ دیکھو آزادی

کو پچیس سال ہو گئے ـــــ راشن . . . ."

لیکن ان دونوں کی بات چیت وہیں ٹوٹ سی گئی، کیونکہ عورتوں

میں سے کوئی نائب تحصیلدار کو سید عادلی کا نمائندہ سمجھ کر یہ بولین سے

شکایت کر رہی تنی ـــ

"سرکار راشن سبھی بردبر نہیں ملتا ہم کو ۔"

"اچھا ـ ؟" سرکار نے اس انداز سے بھنویں چڑھا کر حیرت

کا اظہار کیا جیسے وہ صرف اسی کام کے لیے دورے پر آئے تھے۔

"ہو سرکار ۔" دوسری بولی ۔ شکر تو اِتی کم ملتی کہ ہفتہ بھر کی

شکر دن بھرے میں ای اُٹھ جاتی ۔"

"تمہیں شکر کی کیا ضرورت ہے ـــ تم تو خود اتنی میٹھی ہو ۔"

نائب تحصیلدار نے بڑی مشکل سے اپنے دل کی بات کو ہونٹوں تک

آنے سے روکا ـــ

ایک چلبلی اور نٹ کھٹ سی لڑکی بے باکی سے آگے بڑھی،

اس عمر میں نہ ادب آداب آتے ہیں نہ مرعوب ہونا ـــ

"دسرکار ایک کنواں کھدوا دیو نا ۔" آس پاس اونچی ذات

کے زمیندار، برہمن، پٹیل پٹواری سبھی بیٹھے ہوتے تھے ۔ اس نے

کھل کر کچھ نہ کہا۔ لیکن سب سمجھ گئے ۔ خود نائب صاحب بھی ۔ اپنے گاندھی جی کا سچا پیرو ظاہر کرنے کو بول اُٹھے ۔

"ہم ضرور اس بارے میں اوپر درخواست گزاریں گے، لیکن سوال یہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہریجنوں کا کنواں الگ ہو اور برہمنوں اور اونچی ذات والوں کا الگ ۔ اس سے تو ہمارا بھارت کبھی اُنتی نہیں کر سکے گا۔ ہاں پانی کی کمی کا سوال ہو تو الگ بات ہے ۔" اور انھوں نے گردن اکڑا کر سب کی طرف دیکھا ۔ نہ تالی بجی نہ واہ واہ ہوئی ۔ وہ کچھ کھسیانے سے ہو گئے ۔ بات بنانے کو بولے ۔ "اصل میں اس وقت ہم بیحد تھک بھی گئے ہیں۔ نیند بھی آ رہی ہے ۔ پھر کل سرکاری کاموں کا جائزہ بھی لینا ہے ۔ ایسا کیجئے کہ کل آپ لوگ اپنی اپنی شکایتیں لے کر پہنچ جائیں ۔"

"یہ اُلو کا پٹھا نائب تحصیلدار، کون سا اپنے آپ کو منسٹر سمجھ رہا ہے ۔ کیا ہم کو معلوم نہیں کہ سالے کی ریبنج میں کتنا علاقہ آتا ہے اور اس کے کرنے کے کام کاج کیا کیا ہیں ۔ بناؤ سالو اُلو ہم کو ۔" دِلّو بڑبڑانے لگا تو بھیکو نے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

دوسرے دن نائب تحصیلدار صاحب کا دربار لگا ہوا تھا ۔ گاؤں کا گاؤں اُمڈ پڑا تھا ۔ دِلّو کے باپ کو ابھی ابھی چڑھی تھی، بے حد تراوٹ میں پڑا تھا ۔

دِلّو کو باہر جاتا دیکھ، پوچھنے لگا ۔

"کہاں جارہا بیٹا۔"

"اچھا ہے بابو تم دن رات نشے میں پڑے رہا کرو۔ دنیا کے تماشے تو دیکھنے کو نہیں ملتے۔" سپر کچھ رُک کر بولا۔ "وہ شہر سے بڑے بابو آئے ہیں نا ــــ ذرا ادھر ای چکر لگا رہا ہوں۔"

"بن پہالتو کے جھگڑے مت اُٹھانا۔ ہمیکو بتا رہا تھا کہ کل بھی تو نے کچھ گابلا (گڑبڑ) کیا تھا کر کے۔"

دِلّو کو باپ پر پیار سا آ گیا ــ نشے میں بھی اولاد کی چنتا نہیں چھوٹتی ــ ذرا مسکرا کر بولا ــــ "بابو ہمیکو جھوٹا ہے۔ اس کی بات کا وشواش مت کیا کر۔"

تو سمجھتا ہے میں نسے میں ہوں ــ ؟ میں نسے میں نہیں رہتا۔ بس پی لیتا ہوں۔ تاکت کے واسطے۔"

دِلّو کو پتہ تھا، سالوں پہلے کسی دوست نے باپ کو بتایا تھا۔ "کھجور کے پیڑ کا کھونچ لگا کر پانی نکالا کر اور سورج نکلنے سے پہلے پی لیا کر تو وہ نیرا ہوتا ہے۔ دوائی کا کام کرتا ہے۔ طاقت بڑھاتا ہے" مدتوں باپ یہی کرتا رہا۔ ایک دن پینے کو دیر ہو گئی۔ سورج کی گرمی سے نیرا جھاگ دینے لگا، لیکن وہ اُٹھا کر پی گیا اور وہ زوردار چڑھی ہے کہ سارے گاؤں کو بن ٹکٹ نوٹنکی کا مزہ آ گیا ــــ تب سے باپ جان بوجھ کر دیر کر کے پینے لگا اور سپر بولتا بھی تھا۔

"ارے دنیا میں اتنی گھرابیاں ہیں کہ اچھا ہے نسے میں ٹاتنٹ پڑے رہو۔"

لیکن نشے میں ہونے کے باوجود اُسے دنیا جہاں کی خبر رہتی۔
خاص طور سے دِلّو تو اس کی محبت اور نگہبانی سے تنگ آیا رہتا۔
ہر بچوں میں دِلّو پہلا میٹرک پاس چھوکرا تھا، اس بات کا باپ کو
بے حد غرور تھا۔ وہ بیحد پُر اُمید تھا کہ کوئی دن جاتا ہے کہ اس کا
بیٹا بڑا بھاری منسٹر بن بیٹھے۔

دِلّو کے نکلتے نکلتے بھی اُس نے ایک نصیحت جڑ ہی دی۔"
دیکھ بیٹا جبان کا بومیں رکھا کر، تو نہیں بولنے کی جگہ پر بھی بول جاتا ہے"
دِلّو مسکراتا ہوا باہر نکلا تو آشا دکھائی دی۔ پیلی کھن کھے
ساڑی اور پیلی چولی میں اس کا سانولا سلونا روپ دمک رہا تھا۔
کھلے گھنے بال ہوا سے بہک رہے تھے۔

"بڑے زوروں میں ہے آج تو" وہ بیحد خوش دلی سے
ہنسا۔" ہم تو ویسے ہی مرے ہوتے ہیں، کیا فائدہ ایسے ساج سنگھار
سے۔ اوپر سے انگوڑی (نہانا) بھی کری"
آشا ہنس پڑی۔" چھمیا کا سنوانسہ ہے نا۔ سب ناریل
گڑ لے کر وہیں جا رہاں" اس نے آس پاس کی جھونپڑیوں کی طرف
ہاتھ پھیلا کر اشارہ کیا۔ کتنی لڑکیاں اور عورتیں بن سنور کر جھونپڑوں
سے نکل رہی تھیں۔ " تو کہاں جارا ہے" وہ لگاوٹ سے
بولی"

"ذرا شہری بابو کے رنگ ڈھنگ دیکھنا ہے نا" وہ آگے
بڑھتے ہوئے بولا۔ پھر کچھ ٹھٹک کر بولا" تو اس ملیچھ کے سامنے مت

پڑنا ۔ بول دیا میں ۔"

"ابھی سے تو بدراب (رعب) مت جما ۔" آشا ہنس کر بولی ۔

"کام دھندے سے لگنے کا رستہ دیکھ رہا ہوں، نہیں تو، تو تو ہے ای اپنی ۔"

آشا کی بات دلّو سے بچّی ہو چکی تھی ۔ دلّو کی شدید خواہش تھی، کچھ کرے، کچھ کماتے تاکہ کم سے کم آشا کو جھونپڑے سے بچّے، ایک کمرے کے گھر میں لا کر رکھے ۔ عمر تو ساری جھونپڑیوں میں گزر گئی ۔ وہ اچھے دنوں کی آس میں شادی کو ٹالے جا رہا تھا ۔

کالی، سانولی، گوری، گندمی لڑکیوں، عورتوں اور بچوں کا پرّا کا پرّا سامنے سے گزرنے لگا تو نائب تحصیلدار بے حد خوشی بھری حیرت سے یہ منظر دیکھنے لگے ۔۔ حالی موالی آگے پیچھے لگے ہوتے ہی تھے ۔

"یہ سب کی سب کہاں جا رہی ہیں ۔" وہ کہنا چاہ رہے تھے "یہ ایسرائیں ۔" لیکن اپنے عہدے کا خیال کر کے اور جو عزت یہاں ملی تھی اس کا لحاظ کر کے رُک گئے ۔

"ارے سرکار ہمارے ہاں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑا ادھم (اہتمام) کرتے ۔ گاؤں میں کسی کا سنواسہ (ساتویں مہینے حاملہ کی گود بھرائی کی رسم) ہے ۔ اسی کی رسم ہے ۔"

انھوں نے بیک وقت ساری خوبصورتیوں کو نظر میں بھر لینے ہی ناکام سی کوشش کی —

"اس ٹولی میں یہ کون کون عورتیں ہیں"

"سبھی ہیں سرکار —" ایک زمیندار نے ہانک لگائی —

"ارے ادھر آکے جاؤ ذرا —"

دیکھتے ہی دیکھتے قوس قزح سی بکھر گئی۔

"نمسکار کرو سرکار کو —" بیوپاری بولا۔

"تم بھی ایک ای ہو — نمسکار کیا — ارے پاؤں چھونے کو بولو —"

سرکار نے جوتے اتار دیئے کہ کچھ نرم گرم لمس تو ملے — ایک ایک آگے بڑھتی گئی، چرن چھوتی گئی —

"یہ مالتی ہے — یہ چمپا ہے — یہ لاجو ہے — یہ دھرم ہے — یہ چھبو ہے — یہ مانگ ہے — یہ برفی ہے — یہ بنجارن ہے —" پٹیل ساری جاتیوں کا جاپ کرتے گئے —

"یہ بھیلوا ہے — یہ دھیڑ ہے — یہ چینجی ہے — یہ پاردھی ہے۔ اور یہ ساری آدی واسی ہیں — اور وہ چادروں اور برقعوں میں مسلمان ہیں — کوئی بھی شادی بیاہ ہو — تہوار ہو — مل جل کر سب رہتیاں ہیں —"

"ان میں اونچی جات کے ہندو گھرانے کی عورتیں نہیں ہیں —؟"

سرکار نے قومی یکجہتی کی مثال پیش کرنی چاہی —

"وہ — وہ — وہ سرکار — بات یہ ہے کہ — کہ — وہ اب —" وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگے — "ہم سبھی تو ایک ساتھ رہتے ہیں کر کے ہمارے ہاں ایسا کوئی بھید بھاؤ نہیں — سب۔"

پٹیل کی بے کار بکواس سے تنگ آ کر انھوں نے ایک ہری بھری لڑکی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا —

"اور وہ کون ذات کی ہے —"

"وہ — وہ آشا — وہ ہریجن ہے سرکار — اچھوت —!"

وہ مسکرائے — "نام تو اونچی جات والوں کا سا ہے، مگر"

پٹیل کو سارے گاؤں کی ہسٹری ازبر تھی — ہاتھ مل کر بولے —

"سرکار اصل میں اس کی پیدائش کے سمے اس کی ماں کا کیس بگڑ گیا تھا، اس کو سہاگم بھاگ بیل بنڈی میں ڈال شہر لے گئے تھے۔ وہاں شہر میں پیدا ہوئی تو وہاں کی ڈاکٹرنی بائی نے اپنی پسند سے اس کا نام رکھے تھے —"

"لگتی بھی کچھ شہر کی سی ہی ہے —" وہ بیحد دلچسپی سے اُسے دیکھ رہے تھے —

"ارے کاں سرکار — کل تک تو یہ چھپر باں (لیٹیں) گالوں پہ لٹکا کے گھوم لیتی تھی — اب اب دو تین چوٹریاں بڑھی تو ذرا ٹھکانے کی ہوگئی — آنگ پر دھوتی آئی نہیں تو نومریاں چندیاں

(دپٹے لٹکائے) باندھ کر گھومتی رہتی تھی —"

آشا سخت بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ اتنی دیر تک وہ کبھی موضوع سخن نہیں بنی تھی۔ اُس نے پلّو سے ناک اور ہونٹ ڈھانک لئے اُسے پتہ نہیں تھا کہ ڈھانکنے سے دیکھنے کی چاہ اور بڑھ جاتی ہے، ذرا غور سے اُسے دیکھتے ہوئے سرکار بولے۔

"اور یہ اُس نے ناک میں کیا پہن رکھا ہے —"؟

"ارے سرکار آپ ٹیک (لونگ) کو بول رہے ہیں شاید جو اس کی نکیٹری (نتھنا) میں ہے — یہاں مہاراشٹر کے گاؤں کے سب چھوکریاں پہنتیاں سرکار یہ ٹیک —"

"بہت اچھی لگتی ہے —" پھر کچھ سنبھل کر بولے۔ ٹیک بھی بہت اچھی لگتی ہے —"

پٹیل دنیا دیکھے بیٹھے تھے — بہت سارے کام اپنے کروانے تھے۔ بڑے صاحب کی نظر میں رنگ اُترتے دیکھ مطمئن ہو گئے —

ادھر بڑے صاحب پبلک میں اپنا امیج اونچا کرنے کی خاطر ذرا اپنائیت سے بولے۔

"آپ میں سے جس جس کو بھی تکلیف ہو، کچھ شکایت ہو، کوئی کام ہو، بغیر شرم یا ڈر کے کہیے — میں آپ کا سیوک ہوں —"

بچاری بسنتی کے شوہر نے کل جیپ گاڑی میں صاحب کی بندوق دیکھ لی تھی — ذرا آگے بڑھ کر بولا —

"سرکار ـــ یہاں ایک اجگر بہت بڑا گھومتا پھرتا رہتا ـ آپ
کیسا بھی کر کے اس کو مار ڈالے تو بہت اچھا ہوئیں گا صاب"

اس کے بولتے ہی دوسرے کئی آگے بڑھے ـــ "ہو صاب
یہ بہت پُن کا کام آپ کریں گے ـــ پہلے تو صاب مرگیاں کھایا کھایا
کھایا، پھر اُدھر جمیت داروں کے گایاں کو ڈس ڈس کے گیا ـ اب تو
صاب ہنک کے (بغیر کسی ڈر کے) یہاں آبادی تک آجاتا، ڈر کے مارے
راتوں کو سوتا (نیند) نہیں آتا سرکار"

سرکار کچھ پریشان ہو کر بولے ـــ "بھئی یہ اجگر کیا بلا ہے"

"ارے سرکار بڑے سانپ کو بولتے ـــ اژدھا، آپ شہر
کے لوگ ـــ پڑھے لکھے لوگ بولتے ـ یہاں گاؤں کے لوگ اجگر
بولتے ـ کوڑیالا بولتے"

"بھئی سانپ کوئی شیر تو ہوتا نہیں کہ ہانکا کروایا مچان پر
چڑھے اور دھائیں سے مار دیا ـ یہ زمین پر سرسرانے والا جانور اُس پہ
کیسے قابو پایا جا سکتا ہے"

"نکیں سرکار آپ کے پاس ہم بندوق دیکھے ـــ آپ
چاہے تو مار سکتے ـــ عمر بھر چاکری (غلامی) کریں گے سرکار ـ یہ نصیبت
(مصیبت) سے چھڑادو صاب"

دلو بھی مجمع میں کھڑا ہوا تھا ـــ اور بالکل آشنا کے قریب ـ
جب آشنا کے متعلق بڑے صاحب مسلسل انکوائری کیے جا رہے تھے ـ
تب وہ اپنی جگہ کھڑا انگاروں پر بھن رہا تھا ـ اب وہ انھیں بتانا

چاہتا تھا کہ تم دیکھو میں اس کے اس قدر نزدیک کھڑا ہو سکتا ہوں کیونکہ وہ میری ہے ۔" نائب تحصیلدار نے اُسے سر سے پاؤں تک کچھ غصّہ اور کچھ تمسخر سے دیکھا اور انتہائی ذلّت آمیز لہجے میں اپنے بازو کھڑے آدمی سے پوچھا ـــــ

"یہ ـــــ یہ کون ہے ـــــ" ؟

اگر وہ سیدھے سادے لفظوں میں پوچھ لیتے کہ "یہ کتّا کون ہے"، تو وہ انداز اتنا بُرا نہ لگتا، لیکن وہ لہجہ ـــــ وہ انداز دِلیپ سر سے پاؤں تک اور پاؤں سے سر تک تپا گیا ـــــ ساتھ والا آدمی تحقّر اً بولا ـــــ

" ابھی تو یہ کچھ نہیں ہے کر کے ـــــ لیکن آگے چل کر ایک تو یہ کہ آشا کا آدمی بننے والا ہے اور شاید کچھ اور بھی بن جاتے ۔ الیکشن میں کھڑا ہونے والا ہے ۔"

"چل گئی حکومت ایسے ایسے بھر گئے تو !" وہ زمین پر تھوک کر بولے ـــــ

گاؤں والوں کی نفرت پر خیام کچھ اور بڑھ گیا۔ کیا ہی عجب اتفاق تھا کہ اژدھا جیسا جانور قابو میں آگیا ۔۔ انہونی سی بات تھی لیکن ہو گئی۔ اژدھا مارا گیا اور یوں ہوا کہ اُسی رات اہلکار پٹیل کے پاس گیا ـــ پٹیل خود بھندو کی جھونپڑی پر گیا ـــ پھر پٹیل کے ہاں کی اصلی گھی میں بنی مٹھائیاں، تھال میں سجا کر آشا کے ہاتھ نائب تحصیلدار

260 www.taemeernews.com

کی چھولداری میں بھجوائی گئیں ـــ اور نائب تحصیلدار نے جی بھر کے مٹھائی بھی کھائی اور مٹھائی لانے والی کو بھی کھا گیا ـــ

روز کی طرح سورج نکلا ـــ روز کی طرح صبح ہوئی ـــ روز کی طرح ہر ہر کام ہوا لیکن دو باتیں روز سے ہٹ کر، معمول کے خلاف ہوئیں ـــ

ایک تو یہ کہ اژدھا ـــ پورا نو فٹ لمبا خوب موٹا جوڑا اژدھا نائب تحصیلدار کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا ـــ اور دوسرے یہ کہ شوق کے مارے اژدھے کو آگے بڑھ کر دیکھنے والوں میں دِلّو نہیں تھا ـــ اور یہ بات صرف نائب تحصیلدار جانتا تھا کہ جب وہ رات کے سناٹے میں اژدھے پر تابڑ توڑ گولیاں برسا رہا تھا تو دِلّو بھی کہیں سے نکل آیا تھا ـــ ایک گولی دِلّو کو بھی لگ گئی تھی اور وہ بھی وہیں ڈھیر ہو کر گر پڑا تھا ـــ ایک لمحے کو صرف ایک لمحے کو نائب تحصیلدار کے دل میں یہ خیال آیا ضرور کہیں کسی کو پتہ نہ چل جائے اور مفت میں لینے کے دینے پڑ جائیں ـــ لیکن انھوں نے خود ہی ہنس کر سوچا ـــ

"اب دِلّی سے بڑی سرکار خود چل کر آ کر انکوائری کرنے سے تو رہیں ـــ جنگل، بیابان میں کون پوچھتا ہے، رات گئی، بات گئی ـــ

اور پھر اصل بات تو یہ ہے کہ میرے پاس تو جواز ہے کہ اژدھا اتنا زبردست تھا کہ میں تابڑ توڑ گولیاں مار رہا تھا کہ زندہ نہ رہ جائے کہ بیچ میں وہ لڑکا آ گیا ـــ"!

261 www.taemeernews.com

صبح کے وقت بات چیت کا موضوع اژدھا ہی اژدھا تھا۔

ٹوٹی، بجھری، پتّی پتّی آشا ٹھونٹھ بنی بیٹھی تھی ۔۔۔ ساتھ والیاں، سکھیاں، چھوکریاں سب اُسے اُکسا رہی تھیں ۔۔۔

"چل، اگو باتی ۔۔ چل دیکھ تو ۔۔ کتنا بڑا سانپ ہے ۔۔"

مکتی بولی ۔۔ "دیکھ تو لے کتنا بڑا ہے"

چھنّو دل پکڑ کر بولی ۔۔ "میں تو سپنے میں بھی کبھی اتنا بڑا اجگر نہیں دیکھی ۔۔"

"ادہ تو تو سپنے میں بولتی ہیں تو کبھی سوچی بھی نہیں ۔۔ اژدھا ہے بولتے ۔۔"

دو چار لڑکیوں نے جب اُس سے بہت ہی زیادہ اصرار سے سانپ دیکھنے کو کہا تو آشا ایک عجیب سے لہجے میں بولی ۔۔

"میں نے تو رات ہی میں اژدھا دیکھ لی تھی ۔۔"

~~~ ~~~ ~~~ ~~~ ~~~ ~~~
~~~

www.taemeernews.com

واجدہ تبسم

ایشیا کی سب سے مقبول ترین ادیبہ

واجدہ تبسم نے جب شاعری میں اپنی قدم رکھا تو امریکہ اور کینیڈا میں خوبصورت آواز، ترنم اور شاعری سے دھوم مچادی، ہر مشاعرہ لوٹ لیا۔ ہر جانب ایک ہی پکار تھی۔

واجدہ تبسم واجدہ تبسم واجدہ تبسم

جب واجدہ کا قلم چلتا ہے تو کہکشاں بنتی ہے۔ اور جب وہ مخاطب ہوتی ہیں تو پھول جھڑتے ہیں، جس کا ثبوت ہے یہ ۶۰ منٹ کا کیسٹ

ہرے بھرے خواب

جو شاعری کی دنیا کی دلکش ترین آواز ہے۔ جو ہر لمحہ آپ کے کانوں میں شہد ٹپکائے گا۔ یہ کیسٹ آپکے ادبی خزانے کا انمول ہیرا ہے اس میں غزلیں بھی ہیں اور گیت بھی۔ نظمیں بھی ہیں۔ دکنی زبان بھی۔ طوائف کے ہرے بھرے خواب بھی ہیں اور راہبہ کی پکار بھی اس میں سہاگن کی انوکھی دعا بھی ہے اور سہاگ کا استقبال بھی۔

ملنے کا پتہ: اورسیز بک سینٹر پوسٹ بکس :- ۶۹۴۹
بمبئی ۵۴

آپ گھر بیٹھے ۵۷۸۲۶۳ پر فون کر کے شاعری اور آواز سے سجی واجدہ تبسم کا یہ کیسٹ "ہرے بھرے خواب" منگوا سکتے ہیں جس کے کور پر واجدہ تبسم کی رنگین تصویر بھی ہے۔ ۶۰ منٹ کے اعلیٰ قسم کے کیسٹ کی قیمت ۲۵ روپے بیرونی ممالک کے لئے ڈاک خرچ علیحدہ

www.taemeernews.com

اُردو

جس کے پہلے صرف ہم دیوانے تھے
آج سبھی اس کے دیوانے ہیں

اُردو ادب اور شاعری میں انقلاب' اُردو ادب اور شاعری ایک نئی کروٹ لینے کیلئے بیقرار' اُردو اب امر ہو چکی ہے'. دنیا کی کوئی طاقت اسے پھولنے اور پھلنے سے روک نہیں سکتی

اُردو اب ایک ایک گھر میں ... اپنی رسیلی آواز سے کانوں میں شہد ٹپکائے گا — وہ شاعری جو اب تک کتابوں میں بند پڑی تھی۔ آج وہ گلیوں' کوچوں اور بازاروں میں گونجنے لگی ہے۔

"یہ ہے آواز کی دنیا"

اورسیز بک سنٹر اردو افسانہ اور اردو شاعری کو کتابوں سے نکال کر آج آواز کی دنیا تک لے آیا ہے اب آپ گھر بیٹھے اپنے پسندیدہ فنکاروں کو ان کی اپنی آواز میں سن سکتے ہیں اور عوام کو سنوا سکتے ہیں اور یہ منوا سکتے ہیں کہ اردو خوبصورتی اور حسن کا دوسرا نام ہے۔ جیمیں نکھار بھی ہے اور مٹھاس بھی! یہ بھارت کا سب سے خوبصورت ترین ورثہ ہے۔

آپ شاعری، افسانہ، غزل، سماع، مذہب۔ مشاعرہ۔ تقریریں۔ لطائف' پروگرام پاکستانی یا ہندستانی، امریکی یا انگلستانی یا جس کسی بھی باکمال فنکار کو جب بھی سننا چاہیں اب اپنے ٹیپ ریکارڈر پر سن سکتے ہیں۔ ——— ایک روپے کی ٹکٹ مندرجہ ذیل پتہ پر بھیجا کر آپ کیسٹ کی تفصیلی فہرست منگو لیجئے اور ہمارے اس انقلابی اقدام کو سراہیے

اورسیز بک سنٹر
پوسٹ بکس: 6949
سانتا کروز ویسٹ ۵۴
فون ۵۷۸۲۶۳